نئی دُنیا کو سلام

اور

جمہور

نئی دُنیا کو سلام

اور

جمہور

سردار جعفری

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دلی ۲۵

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

اُردو بازار دلی ۶

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

شمشاد مارکیٹ علی گڑھ ۲

طبع اوّل .. .. مئی ۱۹۴۷ء

طبع دوم .. .. جون ۱۹۷۲ء

تعداد ۱۰۰۰

قیمت سات روپے

(جمال پرنٹنگ پریس، دلی)

ا

نئی دُنیا کو سلام

ایک تمثیلی نظم

پیش لفظ

"نئی دُنیا کو سلام"، میری سب سے طویل نظم ہے۔ اُردو زبان میں اِس طرح کی کوئی چیز اب تک نہیں لکھی گئی ہے۔ اِس لئے یہ نظم پیش کرتے ہوئے مجھے تھوڑی سی جھجک ہو رہی ہے۔ جھجک کی وجہ خود اعتمادی کی کمی نہیں بلکہ نظم کا نیا پن ہے۔ کیونکہ اس سماج میں ہر نئی چیز شک اور شبہ کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ اس کا موضوع بھی نیا ہے اور ٹکنیک بھی نئی۔ زندگی کے متعلق میرا زاویۂ نگاہ بھی دوسرے شعرا سے مختلف ہے اس لئے میں نے اکثر اشاروں کی جگہ تفصیلات سے کام لیا ہے۔ اشاروں اور کنایوں کا وقت بھی کبھی آ جائے گا۔

یہ منظوم تمثیل نہیں بلکہ تمثیلی نظم ہے۔ اس کے کردار کردار نہیں علامتیں ہیں۔ کہانی پلاٹ نہیں بلکہ مبہم سا خاکہ ہے جس کو میں نے رنگ بھرنے کے لئے بنایا ہے۔ واقعات کے بجائے واقعات سے پیدا ہونے والے جذبات، تاثرات اور احساسات پیش کئے ہیں۔ جاوید اور مریم (میاں بیوی) جدوجہد کی علامتیں اور فرنگی ظلم کی علامت ہے۔ نامہ بر ہمارا روایتی کردار ہے جس کے فرائض اس نظم میں بدلے ہوئے نظر آئیں گے۔ سب سے زیادہ اہم کردار وہ بچہ ہے جو ابھی پیدا نہیں

ہوا ہے۔ ابھی اس کے نقش و نگار بن رہے ہیں۔ وہ نئی دُنیا کی علامت ہے۔ اُس کی حسین اور معصوم رُوح پوری نظم پر حاوی ہے۔

میں انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ اُس کا ماضی بڑا شاندار ہے اور حال دلکش امکانات سے معمور ہے۔ حالانکہ آج ہندوستان خانہ جنگی کے کرب میں مبتلا ہے اور ایسی بہیمانہ حرکتیں ہو رہی ہیں جن سے دورِ وحشت کی درندگی بھی شرمائے گی لیکن یہ بلا بھی ہیضے اور طاعون کی وباؤں کی طرح گزر جائے گی۔ کیونکہ اس کے خلاف بھی وہی قوّتیں جدوجہد کر رہی ہیں جو میری نظم میں کارفرما ہیں۔

دُنیا کی تاریخ میں کوئی دَور ایسا نہیں آیا جس میں "انسان" کو شکست ہوئی ہو۔ افراد اور طبقات کو شکست ہوتی رہی ہے اور ہو گی۔ لیکن "انسان" ناقابلِ شکست ہے۔ کیونکہ اس کی محنت، عمل اور جدوجہد اس کے اپنے شعور ہی کی نہیں بلکہ بڑی حد تک اس کے ماحول کی بھی خالق ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ فتح مند اور کامران رہے گا۔ یہ عقیدہ جو اندھا عقیدہ نہیں ہے، میرا سب سے بڑا انسپریشن ہے۔ میں اس کو ادب اور فن کا ابدی موضوع سمجھتا ہوں۔ سب سے زیادہ شاندار، سب سے زیادہ عظیم المرتبت، سب سے زیادہ حسین "انسان" ہے۔

سردار جعفری

بمبئی۔ دسمبر ۱۹۴۶ء

دیباچہ

جدید شاعری اور "نئی دنیا کو سلام"

ازمرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

سردار جعفری صاحب کی طویل تمثیل اور مثنوی "جمہور" جو اسی کا ایک حصّہ ہے پڑھ کر باغ باغ ہوگیا۔ اسی کے ساتھ میرا یہ خیال راسخ ہوگیا کہ شاعری جدید طرز کی ہو یا قدیم طرز کی اوّل فن ہے اور ثانیاً اور کچھ ہے، موضوع کے افادی یا جمالیاتی پہلو سے قطع نظر اگر اندازِ بیان میں تازگی، شگفتگی، نُدرت اور فنکارانہ انفرادیت یعنی خود شاعر کے انفعالی اثرات کا پرتو نہ ہو تو شاعری گھٹیا قسم کی نقّالی بن کر رہ جاتی ہے۔ لائق مصنّف نے یہ گُر سمجھ لیا ہے اور اپنی نظم میں واقعات کے بجائے واقعات سے پیدا ہونے والے جذبات، تاثّرات اور احساسات پیش کئے ہیں۔ یہی راز ہے جس سے ترقّی پسند ادیبوں اور شاعروں کا ایک بڑا حصّہ یا تو بے گانہ ہے یا اس پر کاربند ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ جہاں تک میرا مطالعہ ہے۔ اِس جماعت کے دوسرے شاعر محض واقعات اصلی ہوں یا

فرضی، پلیش کرتے اور ان سے نتیجہ نکالتے یا پڑھنے والوں کے ذہن کے لئے ان کہے چھوڑ دیتے ہیں۔ جعفری صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ایسی اشاراتی شاعری سے اجتناب کیا ہے جس کے ابہام اور مہملیت کا پردہ تحت الشعوری محرکات یا رجحانات کو بنایا جاتا ہے۔ انھوں نے اشاروں کے بدلے تفصیل اور تشریح سے کام لیا ہے اور اپنے نوشتہ "پیش لفظ" میں اس کا اعلان بھی کر دیا ہے۔

مقصد کو مدّنظر رکھتے ہوئے جعفری صاحب نے تمثیل کے افراد کی تعداد قلیل رکھی ہے۔

جاوید اور مریم (میاں بیوی) جہد آزادی کی علامتیں ہیں۔ "فرنگی" ظلم کی نشانی ہے۔ "نامہ بر" روایتی نامہ بر ہے۔ بچّہ جو ابھی پیدا نہیں ہوا نئی آنے والی نسل کا پیش خیمہ ہے۔ موضوع کے لحاظ سے نظم کو "اشتراکیت کا رزمیہ" کہنا بے جا نہ ہوگا۔ یہ بجائے خود ایک اہم اضافہ ہے۔ کیونکہ اُردو میں اب تک رزمیاتی شاعری یا EPIC کے نمونے مراثی تک محدود تھے۔

نظم کے ابواب کی تقسیم اِس طرح سے کی گئی ہے:۔

حرفِ اوّل جس میں ہندوستان کے دورِ ابتلا وافلاس و غلامی کو ایک مہیب سیاہ رات یا ڈراؤنی دیوی سے تعبیر کیا ہے۔ اِس تاریکی کا پردہ چاک ہونے کو انقلاب ضروری ہے۔ ایسا انقلاب جس کا سرچشمہ ضمیرِ انسان کی نورانیت ہے۔ اس کا منشا محض مجنونانہ تخریب نہیں ہے بلکہ نظامِ نَو کی تعمیر ہے۔ جس کا خاکہ ذہن میں ہے۔ مستقبل کے لئے نہیں اُٹھا رکھا گیا ہے۔

پہلی تصویر تاریکی سے دو شکلیں اُبھرتی ہیں۔ جو انقلاب کی نقیب ہیں۔ ایک مرد ہے اور ایک عورت۔ اس میں رمز ہے کہ مردوں اور عورتوں کی متفقہ و متحدہ جدوجہد سے ہی مکمّل آزادی و فراغت نصیب ہو سکتی ہے۔ عورتوں کی سعیِ عمل کا نمائندہ جھانسی کی رانی کی روح کو بنایا گیا ہے۔ رُندھی ہوئی فضا اور غمگین موضوع میں رنگینی و رعنائی کی ایک جھلک دکھانے کو نیز اس امر پر زور دینے کو کہ انقلاب کے حامیوں کو اخلاقی حیثیت سے بھی تمثالِ آدمیت اور مجسّمۂ ایثار ہونا چاہیے۔ جاوید اور مریم کے باہمی ارتباط اور معاشقے کا تذکرہ ہے۔ ان کی محبّت میں پاکی ہی پاکی ہے۔ گو عام طور پر ترقی پسند حضرات ایسی محبّت کے قائل نہیں بلکہ تندو تیز رومان کی تلاش میں رہتے ہیں۔ چاہے کتنی ہی بے ثبات و گریز پا اور نتائج کے لحاظ سے مہلک ہو۔ مریم حیا و عفّت کی پُتلی ہے، جاوید کا عشق ہوس کاری کی بھٹّی نہیں بلکہ اُس کی جڑیں رُوح کی پہنائیوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور وہیں سے سرمایۂ نمو حاصل کرتی ہیں۔

دوسری تصویر مریم اور جاوید میں رشتۂ ازدواج قائم ہو چکا ہے۔ اور "مریم" "دوجی" سے ہے۔ اس حالت اور اس سے متعلق جذبات کی مصوّری جعفری صاحب نے جس نفاست اور چابک دستی سے کی ہے آپ اپنی مثال ہی نہیں بلکہ اُردو میں نئی چیز ہے۔

تیسری تصویر کوڑی کوڑی کو محتاج مریم اپنے ہونے والے بچے کے لئے کُرتا سی رہی ہے۔ کپڑا میسّر نہیں پھٹے پُرانے

جیتھڑے جوڑے جاتے ہیں۔ مگر ہائے ماممتا کا تقاضا اور چونکہ مختلف رنگ کے ٹکڑوں میں تال میل پیدا کرنے کی دُھن ہے۔

چوتھی تصویر

انقلاب کے آثار نمایاں ہیں۔ جاوید اور مریم اِس تحریک میں پیش پیش ہیں۔ حکومت کے خلاف بغاوت کا جرم لگا کر دونوں کو "فرنگی" عدالت کے سامنے لایا جاتا ہے۔ حاکم عدالت کے سوالات، جاوید اور مریم کے جوابات، ان کے تیور اور لب و لہجہ اِس حصۂ نظم کی جان ہیں۔ بعض دوسرے "شاعرانِ انقلاب" کے برخلاف جعفری صاحب نے "عفریتِ انقلاب" کو خون کی ندیاں بہاتے، بوڑھوں اور بچّوں کی ٹانگیں چیرتے، لاشوں کے ڈھیر پر ناچتے، قلقاریاں مارتے، بغلیں بجاتے، شلنگیں بھرتے، انسانوں کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھاتے، ڈکاریں لیتے اور خون آلود ڈاڑھوں سے گوشت کے ریشے نکالتے نہیں دکھایا ہے۔ جاوید اور مریم کی تقریر ذاتی نفرت، بغض و عناد اور کینہ پروری کی تلخیوں سے یکسر پاک ہے۔ ان کی جنگ ایک خاص نظامِ حکومت، ایک خاص تمدّن سے ہے جس کی بنیاد جبر و تعدّی پر ہے اور جس میں دولت کی تقسیم غیر مساویانہ اور نامنصفانہ ہے جس میں غریب کُچلے جاتے ہیں اور ان کے جائز حقوق پامال کئے جاتے ہیں۔ اِس جنگ میں ذاتی پرخاش کو مطلق دخل نہیں۔

جاوید باغی قرار پاتا ہے اور اُس کو سزائے موت کا حکم سُنایا جاتا ہے۔ مریم بظاہر آزاد کر دی جاتی ہے۔ مگر اس کی سزا موت سے سخت تر ہے۔ "عمر بھر صرف رویا کرو۔"

پانچویں تصویر پھانسی پانے سے پہلے جاوید طلوعِ صبحِ نو کی پیشین گوئی کرتا بلکہ بشارت دیتا ہے۔ اِس حصّۂ نظم کے اکثر مقامات اہم ہیں۔ تفصیل کی گنجائش نہیں۔

چھٹی تصویر مریم پھر بھی عورت ہے۔ نوحہ وزاری کرتی ہے۔ نامہ بر مریم کو جاوید کا آخری پیغام سُناتا ہے۔ اِس پیغام میں پوری نظم کا نچوڑ ہے۔ جذبات کا سیلاب ہے۔ کہ اُمڈا آرہا ہے۔

حرفِ آخر

نئے افق سے نئے قافلوں کی آمد ہے
چراغِ وقت کی رنگین لَو بڑھائے ہوئے

قدم بڑھائے ہوئے اے مجاہدانِ وطن
مجاہدانِ وطن ہاں قدم بڑھائے ہوئے

نظم کی جو ہیئت جعفری صاحب نے قائم کی ہے وہ بھی دل کش اور موسیقیت سے لبریز ہے۔ باوجودیکہ معقول حصّے کا پیرایۂ بیان "نظم آزاد" ہے۔ اس سے ان کی عروض سے واقفیت اور زبان پر قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ حرفِ اوّل کے اشعار قافیہ و ردیف کی قید سے کہے گئے ہیں۔ اور قوافی کی تکرار ہے۔ حرفِ آخری شعر میں جسے پہلی تصویر کی تمہید یا نغمے کی الاپ کہنا چاہیے۔ قافیہ و ردیف بدلے ہوئے ہیں۔

حرفِ آخر بھی اسی بحر اور انھیں قوافی و ردیف میں ہے۔ جن میں حرفِ اوّل ہے۔ جیسے گیت میں تال اور سم ہوتے ہیں۔ پہلی تصویر مثنوی کی طرز میں ہے۔ اُس کی حیثیت اُس ساز کی ہے۔ جسے مغنّی مضراب سے چھیڑتا ہے

اور گانے میں آس دیتا ہے۔ دوسری تصویر کا ایک جز واسی بحر اور انھیں قوافی اور ردایف میں ہے، جن میں حرفِ اوّل و حرفِ آخر ہیں۔ گویا آغاز نغمہ سے قبل لے اور دُھن قائم کی گئی ہے۔ باقی حصّہ پہلی تصویر کی طرح مثنوی کی ابیات سے اسی بحر میں مترتب ہے۔ مغنّی ساز پر وہی نغمہ دُہرا رہا ہے، جو لحن میں ادا کرنے والا ہے یا کر چکا ہے۔ تیسری تصویر، ایک حصّہ بطرزِ مخمّس (گیت کی لَے اونچی ہوتی) اِس میں ایک ہی شعر کو متواتر تضمین کیا ہے۔ گویا مغنّی مختلف راہیں نکال رہا ہے، بول بنا رہا ہے، تان کے دانے رکھ رہا ہے۔ باقی حصّے کے پہلے دو شعر مختلف بحر میں ردیف وقافیہ کی پابندی کے ساتھ ہیں۔ جیسے مغنّی کن لگاتا ہے۔ بعدازاں بحر نے آزاد نظم کی صورت اختیار کرلی ہے۔ موسیقی کی اصطلاح میں "تان پلٹے"، کہہ سکتے ہیں۔ بحر متدارک ہے (وزن فاعلن) مگر کسی مصرعے میں یہ اوزان آٹھ مرتبہ سے زیادہ نہیں آتے ہیں۔ اور یہ احتیاط جعفری صاحب کے سلیقے پر دال ہے۔ موسیقی میں بھی اُتار چڑھاؤ کے باوصف تان کی حدیں مقرّر ہوتی ہیں۔ وہ مطلق العنانی نہیں ہے کہ مصرعے شیطان کی آنت ہو جائیں۔ چونکہ اِس تصویر کا بیشتر حصّہ مکالمے کی شکل میں ہے۔ بحر کا انتخاب، مصرعوں کی ترتیب، ارکان کی کمی بیشی یہ سب جعفری صاحب کے صنّاعانہ احساس کی ترجمان ہیں۔ اس کو راگ کی سرگم یا دُھرپد کہنا چاہیے۔ چوتھی تصویر: ایک حصہ، دو دو اشعار کے قطعات کا مجموعہ ہے۔ اسے موسیقی کی "ٹھا"، کہہ سکتے ہیں۔ باقی حصّہ بطرزِ نظم آزاد — بحر متدارک۔

پانچویں تصویر — بحرِ متقارب، چار چار مصرعوں کے قطعات جن میں اوّل و

دوم وچہارم ہم قافیہ ہیں جیسے موسیقی میں گمٹکری اس کے بعد بحرِ مقدار کی بقیہ پھر اسی بحر میں نظم آزاد بعض بعض جگہ قوافی بھی آ گئے ہیں۔ کہیں بلمپت لے ہے کہیں دُرت لے۔ کہیں مدھم کہیں پنچم۔

چھٹی تصویر:۔ بحر متدارک میں بطرزِ مثنوی۔ ایک حصہ نظم آزاد۔ بعدازاں پھر بطرزِ مثنوی، گویا جہاں سے راگ شروع ہوا تھا۔ وہیں بتدریج واپس آکر خفیف ارتعاش کے ساتھ تاروں کا جھنکار میں ختم ہوگیا۔ گستاخی ضرور ہے مگر مجھے اپنی غزل کا ایک شعر سُنانے کی اجازت دیجئے۔

وہ نغمہ تو نے اے مطرب سُنایا
کہ اب تک سنسنی ہے تن بدن میں

عجب نہیں کہ نظم کی ترتیب اور اختلاف بحور جیسا ایک عنوان حرفِ آخر سے مترشح ہوتا ہے۔ حضرت جوشؔ کی زیرِ تدوین کتاب حرفِ آخر سے ذہن میں آئے ہوں۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ جوشؔ (جہاں تک مجھے علم ہے) نظمِ آزاد کے مخالف ہیں۔ یہ کہنے کی بھی جرأت ہوتی ہے کہ تنوع بحر سے اُن کا منشاء صرف اس قدر ہے کہ ایک ہی بحر میں ایک طویل نظم پڑھتے پڑھتے طبیعت اؤب نہ جائے اور دل اُچاٹ نہ ہو جائے۔ جعفری صاحب کے یہاں بحروں کا انتخاب، مصرعوں کی ترتیب اور اوزان میں کمی بیشی، ہیئت کی اندرونی تبدیلیاں ایک خاص مقصد کی تابع ہیں اور وہ یہ ہے کہ بحور کا تنوع، ارکان کی کمی یا زیادتی، لہجے کے تغیّرات نغمے کی لہروں میں ہلچل پیدا کرتے ہوئے طوفانی فضا میں تحلیل ہو جائیں اور طوفان انقلاب کا دوسرا نام ہے۔ اس

کے لئے انھوں نے دانستہ یا نا دانستہ (وجدان و ذوق کی رہنمائی ہیں) ایسی بحروں کا انتخاب کیا ہے جس میں تنوّع ہوتے ہوئے بھی مجانست ہے۔ یعنی

مجتث:- جس کا وزن ہے مفاعلن، فعلاتُن، مفاعِلُن، فِعلن "سیاہ عدل سیہ کلغیاں لگائے ہوئے۔"

ھزج:- مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن "یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے۔"

متقارب:- فعولن فعولن فعولن فعولن "نہاں ابر میں چاند کب تک رہے گا" کہیں زحاف بدلا ہوا ہے۔ اور وزن فعلن فعولن فعلن فعولن ہوگیا ہے۔" دنیا پریشاں خوابوں کی بستی"

متدارک:- فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن (باختلاف ارکان کیونکہ نظم آزاد کا بیشتر حصّہ اسی بحر میں ہے۔" اور فرقِ مراتب سے بیزار ہے" (باختلاف ارکان)

خفیف:- فاعلاتن مفاعلن فعلن "وادیاں گونجتی ہیں نعروں سے"

اس انداز ے کو مزید تقویت قوافی کی پابندی و عدمِ پابندی، بحور کی اُلٹ پھیر، کمی بیشی ارکان وغیرہ سے پہنچتی ہے اور زبانِ موسیقی میں اسی مفہوم کو یوں ادا کر سکتے ہیں:-

راگ شروع ہوا، نغمے کی ہموار لہروں میں تھرتھری پیدا ہوئی۔ تھرتھری سے ہلکی ہلکی سلوٹیں پڑنے لگیں جو پھیلتے پھیلتے اور بڑھتے بڑھتے دائرے بنانے اور پھر کروٹیں اور پھر ہلکورے لینے لگیں۔ چھوٹی بڑی لہریں ٹکرائیں۔ ٹکرا کر

جُدا ہوئیں اور جُدا ہو ہو کر ملیں، شرابور کیا اور خود شرابور ہوئیں۔ اسی کے ساتھ نغمے کی حرکت اور رفتار تیز ہوتی گئی۔ تاہم ترتیب و توازن قائم رہے۔ تناسب و آہنگ میں فرق نہ آیا۔ خاتمہ اس عروج پر ہوا جس سے آگے بڑھنے پر نغمہ محض چیخ بن کر رہ جاتا ہے، ترتیب ابتری میں مبدل ہو جاتی ہے۔

میں نے نظم کے ہر حصّے کی جو مختصر شرح کی ہے اُس سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ نظم میں تسلسل ہوتا ہے۔ ثبوت میں اقتباسات پیش کرنا دشوار ہے۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ اتنے طویل ہوں گے کہ مضمون میں سما نہ سکیں گے۔ مگر مجھے اُمید ہے کہ پوری نظم غور سے پڑھنے کے بعد میرا ادّعا غلط ثابت نہ ہوگا۔

تشکیل و ترتیب کے علاوہ یہ نظم شاعرانہ خوبیوں سے بھی مالا مال ہے۔ چند مثالوں پر قناعت کروں گا۔ یوں تو پوری نظم کافی طویل ہونے کے باوجود از اوّل تا آخر حسین ہے۔

سیاہ رنگ پھریرے ہوا میں اُڑتے ہیں
کھڑی ہوئی ہے سیہ رات سر اُٹھائے ہوئے
سیاہ زلفوں سے لپٹے ہوئے ہیں مار سیاہ
سیاہ پھن ہیں سیہ پھول مُسکرائے ہوئے

زلف اور سانپ کی تشبیہ ابتذال کی حد تک عام ہے مگر سانپ کے پھن کو سیاہ پھول کہنے میں جدّت اور ندرت ہے، مسکرانے کا ثبوت ادھر سیاہ بالوں کی چمک، اُدھر سانپ کے پھن کی چتّیاں اور جگر مُکر کرتی آنکھیں، بالوں کی طرح سانپ کی کینچلی میں بھی چمک ہوتی ہے۔ چونکہ منظر پر ظلمت چھائی ہوئی ہے

بالوں کی چمک دُھندلی ہو کر تلملوں کی طرح نظر آ رہی ہے اور سانپ کے پھن کی سفید چتّیاں ترمرے ہیں۔ جنھیں شاعر نے سیاہ پھولوں میں تبسّم کی جھلک سے تعبیر کیا ہے۔

(نوٹ :۔ تلملے اور ترمرے دونوں الفاظ مرادف ہیں مگر ماخذ الگ الگ ہے۔ "تیل" اور "ملا" سے وہ چمکیلے حلقے یا دائرے جو تیل ملے ہوئے پانی کی سطح پر دکھائی دیتے ہیں۔ ترمرے مرکّب ہے۔ "تر (تارا) اور "ملا" سے۔ دونوں کا اطلاق ان چمکدار نقطوں پر ہوتا ہے جو ضعف کی حالت میں یا چکاچوندھ کے وقت آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ میں نے سانپ کی چتّیوں کے لئے "ترمرا" اور زلف کی چمک کے لئے "تلملا" استعمال کرنا مناسب سمجھا۔ کیونکہ چتّیوں اور تاروں میں مشابہت ہوتی ہے اور تیل کو زلف سے رابطہ ہے۔ وضاحت کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ ایک مرتبہ ایک مقتدر ادیب اور نقّاد نے تلملے کی صحت پر شک ظاہر کیا تھا)

نشاں سیاہ لبوں پر سیاہ بوسوں کے
سیہ نشاط کی بدمستیاں چرائے ہوئے

"بدمستیاں چرائے ہوئے"۔ یہ ہے الفاظ کا صنّاعانہ صرف۔ سیاہ لبوں پر سیاہ بوسوں کے نیل پڑ گئے ہیں اور نیل میں کلونچ مارتی ہوئی سُرخی کا ہونا ضروری ہے۔ کثرتِ مے نوشی اور شدّتِ شہوت و بدمستی میں بھی چہرے کی سُرخی میں سیاہی دوڑ جاتی ہے۔ سیاہی میں سُرخی کی تہہ بے شرمی سے دریوزہ کی ہوئی بھی نہیں بلکہ چرائی ہوئی سُرخی کی تہہ، ان ہونٹوں کو جن میں گلبرگ تر کی

نزاکت و لطافت ہونا چاہیئے تھی کس قدر نفرت انگیز بنا دیتا ہے۔ مجھے مسرّت ہے کہ جعفری صاحب اپنے حریفوں کی طرح معصیت اور بدکاری کو عروسِ پری چہرہ بنا کر پیش نہیں کرتے۔

ہونٹوں پر بوسوں کے نشان رہ جانا اِس امر کا غمّاز ہے کہ اِن بوسوں کو محبت کے تقاضوں سے دُور کا بھی سروکار نہ تھا۔ ان میں وہ سنسنیاں بند نہیں تھیں

"محبّت کے بوسوں نے دے کر جو لیں"

بلکہ یہ بوسے محض حظِ نفس کے لئے ہوس کارانہ دُرشتی اور بے باکی سے لئے گئے ہیں اور بوسے دینے والے کو بھی غلبۂ خواہشات نے ایسا آپے سے باہر کر دیا تھا کہ ان بوسوں کی سخت گیری کو خوشی گوارا ہی نہیں کیا بلکہ ان کی چھلکنے والی بدمستیٔ نشاط کو اپنے ہونٹوں میں جذب کر لیا۔ پھر ایسا تاکہ اس کے نقوش ان عارضی لمحاتِ تلذّذ کی یاد تازہ رکھیں، آگ پر تیل چھڑکتے رہیں۔ اور خیالات میں بھی فسق و فجور کا شعلہ فروزاں اور مشتعل رہے۔ نقل کردہ شعر کو اس سے قبل اور مابعد کے شعر سے ملا کر پڑھنے سے مطلب اور واضح ہو جاتا ہے:۔

سیہ دوپٹوں کے آنچل سیہ جبینوں پر
سیہ لباس سیہ جسم کو چھپائے ہوئے
نشاں سیاہ لبوں پر سیاہ بوسوں کے
سیہ نشاط کی بدمستیاں چرائے ہوئے
سیاہ دُودھ ہے ماں کے سیاہ سینے میں

سیاہ بچّوں کو آغوش میں سلائے ہوئے

غلامی اور افلاس کی رات معصیت کی بھی مسلسل شبِ تار ہے کیونکہ اس میں پرورش پاتے ہوئے بچّے بھی جوان ہو کر اپنے ماں باپ کے ایسے ہوں گے۔ "سلائے ہوئے" ایک معمولی فقرہ ہے مگر اس موقع پر جولانیِ خیال کے لئے کس قدر سامان فراہم کر رہا ہے۔

ایک شبہ یہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ اندھیری رات میں سیاہ چیزیں نظر کیونکر آرہی ہیں؟ یہ حقیقت ہے کہ شب کی پھیلی ہوئی اور محیط سیاہی ایسی تیرگوں نہیں ہوتی کہ ہر شے کو نگاہ سے یک لخت اوجھل کر دے، نقوش دُھندلے ہو جائیں گے مگر نمایاں رہیں گے۔ بسیط سیاہی سرمئی پردہ بن جائے گی جس پر سیاہ چیزیں پرچھائیوں کی طرح دکھائی دیں گی۔ یہ بھی امر واقع ہے کہ آنکھیں تاریکی سے رفتہ رفتہ مانوس ہو جاتی ہیں اور جو چیزیں ابتداءً پوشیدہ تھیں نظر آنے لگتی ہیں۔

اس معصیت آلود تیرگی کا سبب کیا ہے؟ ؎

ضمیرِ عہدِ غلامی کی تیرگی ہے یہ رات
جو پھر رہی ہے اُجالے سے منھ چھپائے ہوئے

یہ ظلمت دُور نہ ہو گی جب تک انقلاب نہ آئے اور انقلاب آ نہیں سکتا جب تک ضمیر نورانیت سے معمور نہ ہو۔ زبانی نعرے لگانے سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔

کہاں ہے روشنیِ صبحِ انقلاب کہاں
ضمیرِ حضرتِ انساں کا آفتاب کہاں

یہلی تصویر پاک اور معصوم محبّت کی سنہری جدول ہے، اس کے چند شعر سُنئے :۔

توشرمائی جاتی ہے میری نظر سے
حجاب اور گُل کو نسیم سحر سے

اِدھر حُسن میں گُل کی نفاست اُدھر عشق میں نسیم سحر کی نزہت و دل کشی و جاذبیت، تاہم حُسن یکسر حیا و حجاب :۔ یہ ہے صحیح نقطۂ اتّصال حُسن و عشق، دوسرے مصرعے کی نشست الفاظ، متعجبّانہ لہجہ سب پاک بازی کی قسمیں کھا رہے ہیں حجاب! اور گُل کو نسیم سے !۔ ممکن ہے کہ مریم کی خوشی نے اس کے جذبات کی ترجمانی کچھ اس طرح کی ہو۔ ؎

حیا یہ حُسن کی نہ جا نظر سے آشکار ہے
کہ عشقِ پاک باز کا اُسے بھی اعتبار ہے

(داغ)

"غروبِ آفتاب کی تصویر"

دن آہستہ آہستہ ڈھلنے لگا تھا
فضاؤں میں سونا پگھلنے لگا تھا
اُفق پر کرن خواب سا بُن رہی تھی
دوپٹے کو اپنے شفق چُن رہی تھی

سورج کی کرنوں کے مختصر اُدھندلا ہونے کو خواب سا بُننا کہنا اور غروبِ آفتاب کے بعد شفق کی سُرخی کے آہستہ آہستہ سمٹ کر غائب ہو جانے کو دوپٹہ چُننے

سے منسوب کرنا تخیّل کی وہ نزاکتیں اور رعنائیاں ہیں جہاں مصوّر کا قلم قطعاً عاجز ہے اور جن پر اُردو زبان جتنا فخر کرے بجا ہے۔

ذیل کے اشعار میں عورت کے ماں بننے سے پہلے کے جذبات کی بے مثل مصوّری اور نفسیات کے اس عظیم الشّان مسئلے کی طرف اشارہ ہے کہ صرف ماں کے مزاج اور کردار ہی کا نہیں بلکہ ان خیالات اور جذبات کے اثرات کا بھی بچّے میں تفویض ہونے کا امکان ہے جو دورانِ حمل میں ماں کے دل و دماغ میں چکّر کھاتے ہیں:۔

کوئی پہلوؤں میں پھڑکتا ہے جیسے
مری سانس میں دل دھڑکتا ہے جیسے
بدن میں ستاروں کی ہے سنسناہٹ
رگوں میں ہے ہلکی سی اک گنگناہٹ
نگاہوں پہ نشّہ سا چھانے لگا ہے
ہر اک چیز پر پیار آنے لگا ہے

ایسی ہی ماں کی گود کا پالا عصرِ نو کا علم بردار ہو سکتا ہے۔

منظر نگاری کا ایک اور دل کش مرقع:۔

ہوائیں مشک بار ہیں، فضائیں زرنگار ہیں
اُفق کے کوہسار میں شفق کے آبشار ہیں
نجومِ شاخ کہکشاں فلک کے برگ و بار ہیں

یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

دوسرا مصرع جتنا نیا اُتنا ہی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ع
اُفق کے کوہسار میں شفق کے آبشار ہیں

ہزاروں قوّتیں مچل رہی ہیں جوئے بار میں
ہزاروں جلوے مسکرا رہے ہیں اک شرار میں
ازل سے بے قرار ہیں کسی کے انتظار میں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

پانی سے طاقت (Hydraulic Power) حاصل کرنے کے جس قدر ذرائع اور امکانات ہیں۔ پہلے ہی مصرعے میں سما گئے ہیں، برقی قوّت یا بجلی کا خزانہ بھی یہی پانی ہے۔ جعفری صاحب کی شاعرانہ زبان میں " ہزاروں جلوے مسکرا رہے ہیں اک شرار میں " موجوں کی بے قراری ایک محرم راز کا بے تابانہ انتظار ہے کہ اُن کو خلقِ خدا کی فائدہ رسانی کے لئے چشمۂ فیض بنا دے۔

نیند کی نقّاشی سے
نیند ہے اک حسینہ
سرمئی آنکھیں ہیں، نیلگوں اُس کا سینہ

اس کی پلکوں کے سایے میں خوابوں کی مدہوش پرچھائیاں کھیلتی ہیں
وہ غریبوں کی غم خوار، دُکھیوں کی دل دار ہے
اور فرقِ مراتب سے بے زار ہے
رات کو آتی ہے
تھپکیاں دے کے سارے جہاں کو سُلا جاتی ہے
بچّوں کو لوریاں دیتی ہے
پھولوں کو پیار کرتی ہے اور سارے عالم پہ جادو بھری انگلیوں سے
چھڑکتی ہے شبنم،

اِس طرح بزمِ فطرت کی ہر چیز کو
اک نئی زندگی بخشتی ہے
اک نئی تازگی بخشتی ہے

لفظوں کا دھیما صوتی لہجہ خود ہی نیند کی ترجمانی اور غنودگی طاری کر رہا ہے۔ بعض مصرعوں کے اجزا کی تقسیم شاید اِس سے بہتر ہو سکتی۔ میں اس جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا۔

ایک حزنیہ :- ؎

رخصت اے زندگی کی بہارو
رخصت اے جاودانی شرارو
رخصت اے آسمانی نظارو
رخصت اے چاند، سورج، ستارو

رخصت اے نیلگوں کوہسارو
رخصت اے نقرئی آبشارو
رخصت اے گنگناتی ہواؤ
رخصت اے مسکراتی فضاؤ
رخصت اے صبح اے شام رخصت
رخصت اے حسن گلفام رخصت
رخصت اے انقلابی جوانو
رخصت اے ہند کے باغبانو
جب نئے خاکے میں رنگ بھرنا
ہم شہیدوں کو بھی یاد کرنا

مگر اس طرح تو میں پوری کتاب نقل کر جاؤں گا، جو ایک پیکرِ جمیل اور میرے اس شعر کی مصداق ہے ؎

ساری ادائیں مختلف پھر بھی تناسب آفریں
جیسے کہ ایک گیت میں سُر ہوں کئی مِلے جلے

لہٰذا "اب خموشی سخن سے بہتر ہے"۔ اس کا مصرع اولیٰ ہے۔ ع

اپنی لذّت میں گم ہوئے نغمے

اس طویل نظم میں کہیں کہیں خامیاں بھی نظر آئیں جن کی طرف نقّاد کی حیثیت سے توجہ دلانا میرا فرض ہے۔

صفحہ ۲۷

زمیں پہ رات کی پلکوں کی چھاؤں پڑتی ہے
اندھیرا سخت خموشی کا بار اُٹھائے ہوئے

جعفری صاحب فقط خوش گو شاعر نہیں بلکہ شعر بہت سمجھ کے کہتے ہیں۔ میں نے کافی غور کیا لیکن تشفی نہیں ہوئی کہ انھوں نے "پلکوں کی چھاؤں کے بدلے" "زلفوں کی چھاؤں" کیوں نہ کہا۔ یہ شعر تمہید ہے اُس وقت کی جب زمین پر سے رات کا غلاف یا ٹوپ ہلکے ہلکے سرک رہا ہے اور "لمحات" جگنوؤں کی طرح ہواایں اُڑتے پھرتے ہیں۔ "جگنوؤں کی "جھپکتی" روشنی اور پلکوں سے چھن چھن کے نکلنے والی روشنی میں تناسب قائم رکھنے کو غالباً "پلکوں کی چھاؤں" کا انتخاب کیا گیا۔ اس کے باوصف میں اپنے خیال پر قائم ہوں کہ زمین پر رات کی پلکوں کی چھاؤں پڑنا خلاف حقیقت ہے۔ پلکوں کی چھاؤں پڑے گی تو خود رات کے چہرے پر نہ کہ زمین پر۔ اب رہی جگنوؤں کے چمکنے سے مشابہت یا مناسبت، تو جس طرح پلکوں کی چلمن سے نور و ظلمت ایک ساتھ چھنتے اور عکس افگن یا سایہ افگن ہو سکتے ہیں یہی کیفیت زلفوں کے حلقوں اور پیچ و خم سے پیدا ہو سکتی ہے بلکہ جہاں تک جگنوؤں کے اُڑتے پھرنے اور سہمی سہمی شرمیلی جگمگاہٹ کا تعلق ہے ایسی جھلمل جھلمل کرتی آنکھ مچولی کھیلتی روشنی مہیا کرنے کی صلاحیت زلفوں کی چھاؤں میں ہے۔ پلکوں کی چھاؤں اس سے قطعاً محروم ہے۔ شطرنجی (chequered) اور جلد جلد بدلنے والی روشنی گویا درخت کی پتیوں سے روشنی چھن چھن کر زمین پر سایہ و نور کے جال بُن رہی ہے۔ زُلفوں کے متحرک سائے میں ہو سکتی ہے نہ کہ پلکوں

کے سایے ہیں۔

اسی طرح خموشی کے ساتھ "سخت"، کا استعمال شاعرانہ نہیں، سخت خموشی سے جعفری صاحب کی مراد گہری خاموشی ہے۔ مگر میرا ذوقِ شعری کہتا ہے کہ منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے "سرد خموشی" کہنا کہیں بہتر ہوتا۔ اس طرح خموشی برف کی طرح خنک اور بے حس لاش بن جاتی جس کا پارہ پلایا ہوا لنگر جسے انگریزی میں (Dead Weight) کہتے ہیں۔ سنبھالنا سخت خموشی کی گراں باری سے زیادہ دشوار اور ایذار ساں ہے۔

صفحہ ۴۱ "وہ نغمے پختہ ہو رہے ہیں اب تلک جو خام ہیں" اب تلک" کے ہوتے زبان کا تقاضا ہے کہ "خام ہیں"، کی جگہ "خام تھے"۔ یہ الجھن ختم ہو جاتی اور فرقِ زمانی مٹ جاتا۔ اگر مصرع یوں موزوں ہوتا ع وہ نغمے پختہ ہو رہے ہیں جو ہنوز خام ہیں۔ اس میں ان لوگوں کے لئے درس بھی ہے جو لفظ ہنوز کو متروک سمجھتے ہیں۔

صفحہ ۴۳ "جب وہ دُنیا میں آئے گا تو ماما کی محبت"، ماما کے معنی ہیں ماں کی محبت۔ اس کے ساتھ محبت کا اضافہ یقیناً غلط ہے۔ یہ مصرع آزاد نظم میں واقع ہے۔ اگر "کی محبت"، کا ٹکڑا نکال دیا جائے تو وزن میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

صفحہ ۴۸ چکیاں چپ ہیں، خاموش ہیں گاؤں کی لڑکیاں چوڑیاں گنگناتی نہیں" چوڑیوں میں کھنک ہوتی ہے نہ کہ گنگناہٹ۔ غالباً یہ عیب اِس طرح مٹ جاتا۔

گاؤں کی لڑکیاں گنگناتی نہیں
چوڑیاں اب کھنکتی نہیں

اس حصۂ نظم میں قافیہ نہیں ہے ورنہ "چوڑیاں کھنکھناتی نہیں" بھی کھپ سکتا تھا۔ گو کھنکتی کھنکھناتی سے فصیح تر ہے۔ کھنکھنا نا ردیف کے لیئے زیادہ موزوں ہے۔

ممکن ہے جعفری صاحب کو خیال گزرے کہ چوڑیوں کا "گنگنانا"، صفحہ ۴۷ پر بھی نظم ہوا ہے۔ مگر وہاں اعتراض نہیں کیا گیا۔ میرا جواب یہ ہے کہ صفحہ ۴۷ پر ایک طرب انگیز منظر کی مصوّری ہے جس میں آسمان ناچ رہا ہے۔ زمین توڑے لے رہی ہے۔ کھیت کٹ رہے ہیں۔ کھلیان لگ رہے ہیں۔ چکّیاں گھُمر گھُمر کر رہی ہیں۔ لڑکیاں گا رہی ہیں، چوڑیاں گنگنا رہی ہیں۔ چہرے آگ یا الاؤ کی آنچ میں تمتما رہے ہیں۔ لہٰذا خوشی کی ترنگ قائم رکھنے کو چوڑیوں کے کھنکنے کو گنگنانے سے تعبیر کرنا مناسب تھا۔ صفحہ ۴۸ پر جو منظر ہے وہ الم ناک ہے، عصمتیں تباہ ہو رہی ہیں، عزتیں بِک رہی ہیں، گولیاں چل رہی ہیں، بے گناہوں کے خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں، چکّیاں خاموش ہیں، جو لڑکیاں گاتی تھیں وہ گنگناتی بھی نہیں، یہ تغیّر جعفری صاحب نے کیا ہے۔ یعنی جو لڑکیاں گاتی تھیں، وہ گنگناتی بھی نہیں۔ مگر بدلے ہوئے منظر میں جہاں تک چوڑیوں کا تعلق ہے صرف گنگنانے کی نفی پر قانع ہو گئے۔ حالانکہ صنّاعانہ تقابل متقاضی تھا کہ جس طرح لڑکیوں کے گانے سے ایک درجہ گھٹا کر گنگنانے کی نفی بھی کی تھی، اُسی طرح پہلے منظر کے بالعکس چوڑیوں کے گنگنانے کو ایک درجہ

گھٹا کر اُس کی بھی نفی کر دیتے اور چوڑیوں کے لئے یہ صورت کھنکنے کی نفی تھی۔
یعنی چوڑیوں کا گنگنانا کیسا اب کھنکتی بھی نہیں۔

اس ضمن میں میرے مجوّزہ مصرعے میں لفظ "اب" کی اہمیّت بھی نظر انداز نہ ہونا چاہیئے۔

صفحہ ۵۸ " خاک کے بطن میں اَن جنی کونپلیں ناچتی ہیں"

لفظ "اَن جنی" نہ صرف غیر شاعرانہ بلکہ فضول ہے کیونکہ جو چیز بطن میں ہے وہ نوزائیدہ ہے۔ یہ حصّہ نظم آزاد میں ہے۔ "ان جنی" کا ٹکڑا نکال دینے سے وزن میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔

"کونپلیں ناچتی ہیں" کو "کونپلیں اینڈتی ہیں" کہنا بہتر ہوتا۔ اینڈنے میں پھیلنے، بل کھانے کا مفہوم ہے، بانکپن بھی ہے، نیز اس کی حرکت ناچنے سے خفیف تر ہے۔ بطنِ خاک میں کونپلوں کا اینڈنا کونپلوں کے ناچنے سے زیادہ حقیقت سے قریب اور شاعرانہ صداقت سے قریب تر ہوتا۔

صفحہ ۵۸ "گیہوں اور دھان کی نرم ناپیدا رشاخیں"

"ناپیدا" کا الف اس بُری طرح دبتا ہے کہ روانی اور ترنّم کا خون کیے دیتا ہے۔ صرف "ناپید" میں (بغیر الف) عدم نایابی کا مفہوم ہے، پیدا کی محض نفی نہیں ہے۔ اس کے استعمال سے جعفری صاحب نے بجا طور پر احتراز کیا۔ شاید اس کا بدل "اٹھلاتی" ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے بعد کا مصرع ہے "رنگ اور نور میں کھیلنے کے لیے مضطرب ہیں" اٹھلانے میں شوخی و ناز و غمزہ ہے۔ جو رنگ و نور میں کھیلنے پر اُبھارتا ہے۔

صفحہ ۷۳

یہ ہیں وہ لال جو نشانی تھے
اپنی ماں باپ کی محبّت کی
آج سے یادگار ہیں لیکن
ملک اور قوم کی شجاعت کی

"محبّت کے" اور "شجاعت کے" کہنا چاہیئے تھا (یائے مجہول بجائے یائے معروف) اہمیّت لال کو دینا ہے نہ کہ نشانی اور یادگار کو۔ علاوہ بریں فصاحت کا یہ بھی ایک گُر ہے کہ جب حرفِ ربط اپنے متعلّق اسم سے دُور جا پڑتا ہے تو حرفِ ربط کی تانیث کو تذکیر سے بدل دیتے ہیں۔ کیونکہ کانوں کو اسی طرح بھلا معلوم ہوتا ہے۔ آتش کا مطلع ہے ؎

"معرفت میں اُس کی ذاتِ پاک کے
اُڑتے ہیں ہوش و حواس ادراک کے

(یہ اعتراض صحیح ہے اور میں نے ترمیم قبول کرلی ہے۔ سردار)

نظریں اس طرح کیوں بجھ گئی ہیں
ہاتھ میں چوڑیاں کیوں نہیں ہیں

اس بند کے اشعار ماقبل و مابعد میں قافیئے کی قید ہے۔ مگر نقل کردہ شعر قافیے سے عاری ہے۔ غالبًا قافیے کی بنیاد "گئی" اور "نہیں" کے صوتی التباس پر رکھی گئی ہے۔ بعض شاعرانِ حال اسے جائز سمجھتے ہیں۔ مجبوری ہو تو وہ مختار ہیں مگر جب مصرعے میں قافیہ لایا جاسکتا ہے اور مطلب میں فرق

نہیں پڑتا تو الزام سے بچ نہیں سکتے۔ مصرع یوں بدلا جا سکتا ہے۔ ع

"کس لیے نظریں سوئے زمیں ہیں"

نظروں کو جھکا ہوا کہنا بھی فصیح نہیں۔ یہ تیور کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ علاوہ بریں اُن کے مصرعے میں اِس طرح کا ٹکڑا بھی حشو کی سرحد سے بہت دُور نہیں۔

صفحہ ۱۵۵ "بغل میں کُرّۂ ارضِ حسیں دبائے ہوئے"، نظم بھر میں یہی ایک مصرع عذوبت سے خالی اور سامع خراش ہے۔ صحیح لفظ "کُرہ"، بلا تشدید رائے مہملہ کہ (کُرّہ) بروزن "دُرّہ" جس طرح کہ نظم ہوا ہے۔ مصرع یوں بدلا جاسکتا ہے "کُرہ زمین کا زیرِ بغل دبائے ہوئے"۔

صفحہ ۱۶۴ "یہ چاندی کے پگھلے ہوئے آبشار"

آبشار پگھلے ہوئے نہیں ہیں بلکہ چاندی پگھلی ہوئی ہے۔ لہٰذا مصرع اس طرح موزوں کرنا چاہیے تھا۔ "یہ پگھلی ہوئی چاندی کے آبشار"

صفحہ ۱۷۵

گھٹاؤں میں تبدیل ہوگا دھواں

برسنے لگیں گے ستارے یہاں

ستاروں کا برسنا یا ٹوٹنا منحوس نہ سہی خطرناک ضرور ہے۔ بظاہر شاعر کا مافی الضمیر یہ ہے کہ دھواں گھٹا بن جائے گا۔ گھٹا برسے گی اور قطرہ ہائے آب ستاروں کی طرح چمکیں گے۔

گرد و پیش کے اشعار سے کچھ واضح نہیں ہوتا کہ دھویں سے کیا مُراد ہے۔ اور

دھواں گھٹا بن کر کیونکر منتقل ہوگا۔ اور ستارے برسنے کی توجیہ کیا ہے۔ غالباً مُدّعا یہ ہے کہ جہاں اِس وقت تاریکی چھائی ہوئی ہے اور فضا مکدّر ہے وہاں نورانیت پھیل جائے گی۔ اگر میرا قیاس غلط نہیں تو مفہوم اِس طرح ادا ہو سکتا تھا۔

جہاں آج کل گھُٹ رہا ہے دھواں
چمکنے لگیں گے ستارے وہاں

ان تسامحات سے اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ تسامحات ہیں، نظم کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ مجموعی حیثیت سے یہ نظم قابلِ قدر اور اُردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ کاش دوسرے ترقّی پسند ادیب اور شاعر ایسی ہی راہوں پر گامزن ہوں جو سردار جعفری صاحب نے نکالی بلکہ تراشی ہیں تو میں ان کی تعریف میں بخل نہ کروں بلکہ ان کی ثنا و صفت کے ترانے گاؤں، کچھ اس انداز سے:-

بہار ہے ترے عارض سے لَو لگائے ہوئے
چراغ لالہ و گُل کے ہیں جھلملائے ہوئے

فی الحال اس کے مخاطب صحیح سردار جعفری صاحب ہیں جن کی نظم کے مطالعہ کے دوران میں یہ مَطلع بلا تکلف موزوں ہوگیا۔

(ماہ نامہ منذر لکھنؤ
شمارہ ۱۰ اپریل ۱۹۴۹ء)

نوٹ۔ اس مضمون میں صفحات کے حوالے کتاب کے پہلے ایڈیشن پر نہیں ہیں۔

گریزد از صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

نظیری

کردار

جاوید
فرنگی

مریم
نامہ بر

زندگی
تاریخ
وقت
موت

حرفِ اوّل

سیاہ رنگ پھریرے ہوا میں اُڑتے ہیں
کھڑی ہوئی ہے سیہ رات سر اُٹھائے ہوئے
سیاہ زُلفوں سے لپٹے ہوئے ہیں مارِ سیاہ
سیاہ پھَن ہیں سیہ پھُول مُسکرائے ہوئے
سیاہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہِل رہی ہے زمین
سیہ عقاب سیہ آسماں پہ چھائے ہوئے
سیاہ سینوں کو تانے ہوئے سیاہ پہاڑ
سیاہ لوہے کی دیوارسی بنائے ہوئے
سیاہ وادی و صحرا سیاہ دریا ہیں
سیاہ دشت، سیہ کھیت لہلہائے ہوئے

سیاہ فیکٹری کی سیاہ چمنی پر
سیہ دھوئیں کے سیہ ابر تھرتھرائے ہوئے
سیہ چراغ، سیہ روشنی، سیاہ لویں
سیاہ گھر میں سیہ جال سا بچھائے ہوئے
سیاہ کیڑوں کے مانند رینگتی مخلوق
سیاہ بھوت اندھیرے میں بلبلائے ہوئے
سیہ دوپٹوں کے آنچل سیہ جبینوں پر
سیہ لباس سیہ جسم کو چھپائے ہوئے
نشاں سیاہ لبوں پر سیاہ بوسوں کے
سیہ نشاط کی بدمستیاں چُرائے ہوئے

سیاہ دودھ ہے ماں کے سیاہ سینے میں
سیاہ بچّوں کو آغوش میں سُلائے ہوئے
سیہ فضا میں سیہ تیر سنسناتے ہیں
سیاہ تیر سیہ زہر میں بُجھائے ہوئے
سیاہ دار، سیہ پھانسیاں، سیہ پھندے
سیاہ ہاتھ سیہ گردنیں دبائے ہوئے
سیہ نشان بدن پر سیاہ کوڑوں کے
سیاہ زخم سیہ درد کو جگائے ہوئے

سیاہ جبر، سیہ عصمتیں، سیہ چیخیں
سیاہ عدل، سیہ کلغیاں لگائے ہوئے
سیاہ رنگ کے ساحر سیہ لبادوں میں
سیہ حصار، سیہ تیوریاں چڑھائے ہوئے
ضمیرِ عہدِ غلامی کی تیرگی ہے یہ رات
جو پھر رہی ہے اُجالے سے منھ چھپائے ہوئے

کہاں ہے روشنیِ صبحِ انقلاب کہاں؟
ضمیرِ حضرتِ انساں کا آفتاب کہاں؟

پہلی تصویر

محبت نے کاڑھا ہے ظلمت سے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

میر

پہلی تصویر

(اندھیرے سے دو شکلیں اُبھرتی ہیں۔ جاوید دولھا
بنا ہوا اور مریم دُلھن۔)

نہاں ابر میں چاند کب تک رہے گا
بھلا عشق سے حُسن کب تک چھپے گا
تو شرمائی جاتی ہے میری نظر سے
حجاب اور گُل کو نسیم سحر سے
تو کیا میری فطرت کی محرم نہیں ہے؟
تو کیا میرے بچپن کی مریم نہیں ہے؟

گزاریں جو راتیں تری آرزو میں
سمٹ آئی ہیں کاکلِ مشک بُو میں

جو پلکیں حیا سے جھُکی جا رہی ہیں
وہ کچھ اور دل میں چُبھی جا رہی ہیں

ترے رُخ پہ حُسن و محبّت کا ہالہ
یہی ہے مری زندگی کا اُجالا

یہ شفاف آنکھیں، یہ آنکھوں کے ڈورے
چھلک جائیں جیسے گلابی کٹورے

جو ہاتھوں کو رنگِ حنا مِل گیا ہے
ہتھیلی پہ گویا کنول کھل گیا ہے

محبت کی راتوں کی قندیل تو ہے
جوانی کے خوابوں کی تکمیل تو ہے

یہ اک آنچ سی تیری نیچی نظر میں
ترے حسن سے روشنی میرے گھر میں

تکلم سے نغموں کی دُنیا جگا دے
تبسّم سے پھُولوں کو ہنسنا سِکھا دے

(مریم زیرِ لب مسکراتی ہے)

تری مسکراہٹ میں کیا دل کشی ہے
یہ پھولوں پہ سوئی ہوئی چاندنی ہے
مگر رُوح کی پیاس کیونکر بجھے گی؟
سمندر سے کیا صرف شبنم ملے گی؟
محبت ہے، نغمہ ہے، مے ہے، خوشبو ہے
مرے واسطے جو بھی کچھ ہے وہ تو ہے
تری خامشی کہہ رہی ہے فسانہ
تجاہل ہے تیرا بڑا عارفانہ
ہمارے دلوں کی ہے حسرت پرانی
ہماری شرابِ محبت پرانی
وہ گزری ہوئی شام ہے یاد اب تک
وہ ہے میرے سینے میں آباد اب تک
دن آہستہ آہستہ ڈھلنے لگا تھا
فضاؤں میں سونا پگھلنے لگا تھا
دھندلکے کی پرچھائیاں ناچتی تھیں
ہر اک سمت انگڑائیاں ناچتی تھیں
اُفق پر کرن خواب سا بُن رہی تھی
دوپٹے کو اپنے شفق چُن رہی تھی

تری رُوح و دل پر تھے بادل سے چھائے
کھڑی تھی مرے پاس گردن جھکائے
مگر نکہتیں اپنی برسا رہی تھی
ترے پیرہن سے مہک آ رہی تھی
ترے سر سے آنچل جو ڈھلکا ہوا تھا
مرے خون میں ساز سا بج رہا تھا
اسی رات کی طرح پلکیں جھُکی تھیں
دھڑکتا تھا دل اور نبضیں رُکی تھیں
کیا پیار سورج نے جھُک کر زمیں کو
سجایا ستاروں سے شب نے جبیں کو
پھسل کر سیہ زُلف شانوں پر آئی
ترے رُخ پہ اک شمع سی جھلملائی
مجھے تو نے دیکھا نگاہیں اُٹھا کر
کہا پھر اشاروں میں کچھ مُسکرا کر
سمجھ کر نگاہوں کا پیغام ہم نے
محبّت کا پہلا پیا جام ہم نے
اسی جام نے ہم کو سرشار رکھا
ہماری تمنّا کو بیدار رکھا

جدائی میں بھی صبر کرنا سکھایا
ہمیں آگ پر سے گزرنا سکھایا
مُرادوں کی مانگی ہوئی رات ہے یہ
کہ بچھڑے ہوؤں کی ملاقات ہے یہ

(مریم جاوید کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتی ہے اور پھر پلکیں جھکا لیتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے دو چمکتے ہوئے آنسو ٹپک پڑتے ہیں اور چمپئی رخساروں پر چاندی کی دو لکیریں سی کھنچ جاتی ہیں۔)

مریم

مری ساری دولت محبّت کے آنسو

جاوید

محبّت کے آنسو، مسرّت کے آنسو
یہ آنسو ہیں ٹوٹے دلوں کے سہارے
یہ تقدیرِ آدم کے روشن ستارے
تری ساری ہستی تری چشمِ نم میں
مرے گھر کی برکت ہے تیرے قدم میں

ہر اک رنج و راحت کی ساتھی ہے عورت
جہنم کو جنّت بناتی ہے عورت
جبیں پر تجلّی کی انجم فشانی
نظر میں زلیخا کی ہنستی جوانی
وہ مطلوب بھی ہے طلب گار بھی ہے
وہ غم خوار بھی اور دل دار بھی ہے
وہ ہے ساز بھی، نغمہ بھی، نغمہ گر بھی
گلستاں بھی، گُل بھی، نسیمِ سحر بھی

مریم

مجھے بھی تو ہے یاد وہ رات اب تک
ہیں مٹھی میں میری وہ لمحات اب تک
کلی کی طرح جو کِھلے جا رہے تھے
جو گُھل کر لہو میں مِلے جا رہے تھے
تمنائیں لہراتی تھیں خواب بن کر
برستے تھے جگنو اندھیرے سے چھن کر
حجاب اُٹھ گئے تھے زمان و مکاں کے
دریچے تھے وا لذّتِ جاوداں کے
رگوں میں مری دوڑتے تھے شرارے
مرے گرد تھے رقص میں چاند تارے

وہ رات آئی تھی ایک طوفان بن کر
سمندر کے سینے کا ہیجان بن کر
محبّت کی کیف آفریں رات تھی وہ
جوانی کی سب سے حسیں رات تھی وہ

جاوید

وہ رات آج تک حُسن برسا رہی ہے
وہ رات آج کی رات لہرا رہی ہے

دوسری تصویر

باغ کے آغوش میں گل چاہیئے
زندگانی میں تسلسل چاہیئے

جعفری

دوسری تصویر

جاوید کا گیت

زمیں پہ رات کی پلکوں کی چھانوں پڑتی ہے
اندھیرا سخت خموشی کا بار اُٹھائے ہوئے
ہوا میں اُڑتے ہیں لمحات جگنوؤں کی طرح
فضا کے سینے میں اک آگ سی لگائے ہوئے
سرک رہے ہیں اندھیرے کے مخملیں پردے
نکل رہا ہے کوئی جسم کو چُرائے ہوئے

اُبھر رہا ہے کوئی وقت کے تلاطم سے
جبیں پہ قوسِ قزح کی کماں جھکائے ہوئے
خمارِ نیم شبی کا ہے آنکھ میں کاجل
ہتھیلیوں پہ حنا کے کنول جلائے ہوئے
مری جوان تمنّا کے شوخ پھولوں سے
سیاہ زلف کو گوندھے ہوئے سجائے ہوئے
وہ دُھندلے دُھندلے ستاروں کے نرم جُھرمٹ میں
کنارے سُرخ دوپٹے کے جگمگائے ہوئے
دھڑکتے سینے پہ آنچل کی ریشمی شکنیں
گزشتہ شب کی حسیں چاندنی چھپائے ہوئے
سڈول اور سُبک بازوؤں کی لرزش میں
شباب و شعر کی انگڑائیاں دبائے ہوئے
کھڑی ہے خواب و فسانہ کی سرحدوں کے قریب
اندھیری رات کے دل میں چمن کھلائے ہوئے
وفا کے جوش سے چہرے پہ روشنی دل کی
حیا کے رنگ سے رخسار تمتمائے ہوئے
بھوؤں پہ جتنی ہی انکار کی حسیں شکنیں
لبوں پہ اتنے ہی اقرار مُسکرائے ہوئے

مریم

یہ مانا محبت کی منزل ہے عورت
تڑپتا مچلتا ہوا دل ہے عورت
پر اس کے زمان و مکاں اور بھی ہیں
"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"
اُبھرتی ہوئی وقت کے ساحلوں سے
گزرتی ہے وہ کتنی ہی منزلوں سے
کبھی جام بن کر چھلکتی ہے عورت
کبھی اشک بن کر چمکتی ہے عورت
وہ بس چند لمحوں کی ہمدم نہیں ہے
کہ عورت فقط شہد و شبنم نہیں ہے
تبسم نہیں صرف، تلوار بھی ہے
وہ نغمہ نہیں صرف، جھنکار بھی ہے
محبت کی مسند پہ حسن و جوانی
شجاعت کے میداں میں جھانسی کی رانی
وہ شمع شبستاں ہے، نورِ سحر ہے
وہ ہر گام پر مرد کی ہمسفر ہے
مگر سب سے بڑھ کر تو یہ ہے کہ ماں ہے
وہ تخلیق کے دل کا سوزِ نہاں ہے

صدف کی چمک میں ہے موجِ گہر بھی
کلی میں نہاں گُل بھی ہے اور ثمر بھی
نگاہوں میں ہے شوخیِ دلبرانہ
جبیں پر مگر عظمتِ مادرانہ
وہ عورت کی جسمانیت کی چمک ہے
یہ عورت کی روحانیت کی جھلک ہے
جوانی کو شاداب کرتی ہے عورت
محبّت کو سیراب کرتی ہے عورت
ہے انسان کی کائنات اس کے دم سے
فروزاں ہے شمعِ حیات اس کے دم سے
جس آنچل کو بچّے پہ وہ ڈالتی ہے
جس آغوش میں طفل کو پالتی ہے
اس آنچل میں ہے زندگی کا شرارہ
وہ آغوشِ تہذیب کا گاہوارہ
محبّت کی راتوں کی شیرینیوں کو
جوانی کی پُرکیف رنگینیوں کو
نگاہوں کے رس کو لبوں کی شکر کو
مہکتے تبسّم کے گُھنائے تر کو

نیا رنگ اور رُوپ دیتی ہے عورت
نئی شکل میں ڈھال لیتی ہے عورت

جاوید

جو کونپل تھی کل اب ہے پھُولوں کی ڈالی
تو ہے میرے بچّے کی ماں بننے والی

مریم

کوئی پہلوؤں میں پھڑکتا ہے جیسے
مری سانس میں دل دھڑکتا ہے جیسے
رگ و پے میں کوئی سمایا ہوا ہے
مری رُوح پر رنگ چھایا ہوا ہے
کوئی دل میں انگڑائیاں لے رہا ہے
مرے خون میں کشتیاں کھے رہا ہے
بدن میں ستاروں کی ہے سنسناہٹ
رگوں میں ہے ہلکی سی اک گنگناہٹ
مرے ذہن میں چل رہی ہیں ہوائیں
اُمنڈتی ہوں جیسے سنہری گھٹائیں
بگڑتی ہیں، بنتی ہیں، شکلیں، فضا میں
مہکتے ہیں لاکھوں شگوفے ہوا میں

یہ اک موجِ طوفاں ہے جو بڑھ رہی ہے
ندی دم بدم دم بدم چڑھ رہی ہے
لگا ہوں پہ نشہ سا چھانے لگا ہے
ہر اک چیز پر پیار آنے لگا ہے
زمیں، آسماں، چاند، سورج، ستارے
مجھے دُور سے کر رہے ہیں اشارے
بہاریں مری رازداں ہو گئی ہیں
ہوائیں مری ہمزباں ہو گئی ہیں
نسیمِ سحر گدگداتی ہے مجھ کو
کلی دیکھ کر مسکراتی ہے مجھ کو
اک ارمان آغوش میں پل رہا ہے
تصوّر مرا گھٹنیوں چل رہا ہے
لہو ناچتا ہے، رگیں ٹوٹتی ہیں
مرے جسم سے کونپلیں پھوٹتی ہیں

جاوید

حیاتِ بشر ہے بڑی شاعرانہ
محبّت ہے جس کی بقا کا بہانہ
وہ نغمہ جو بنتا ہے سرگوشیوں سے
جو ہوتا ہے پیدا ہم آغوشیوں سے

لرزتی ہیں پلکیں، سمٹتے ہیں ابرو
پھڑکتے ہیں پہلو، مچلتے ہیں بازو
تڑپتے ہیں دل اور دھڑکتے ہیں سینے
جوانی نکلتی ہے لے کر سفینے
چمکتے ہیں ماتھے، دمکتے ہیں چہرے
مہکتے ہیں پھولوں کے شاداب سہرے
نکھرتا ہے صندل، جھلکتی ہے افشاں
لچکتی ہیں شاخیں، چٹکتی ہیں کلیاں
اُبھرتے ہیں جلوے، بکھرتے ہیں جلوے
بکھرتے ہیں جلوے، سنورتے ہیں جلوے
ڈھلکتے ہیں گیسو، سرکتے ہیں آنچل
اُمنڈتے ہیں بادل، برستے ہیں بادل
یونہی اُڑ رہا ہے نشاں زندگی کا
ٹھٹکتا نہیں کارواں زندگی کا
تسلسل حقیقت، تسلسل فسانہ
تسلسل ہی ہے زندگی کا ترانہ
کرن سے کرن اس طرح چھوٹتی ہے
کہ جس طرح سے پھلجھڑی چھوٹتی ہے

تیسری تصویر

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

اقبال

تیسری تصویر

(مریم پھٹے ہوئے کپڑوں کے ٹکڑوں سے اپنے ہونے والے بچّے کے لیے ایک چھوٹا سا کُرتا سی رہی ہے۔ کپڑے کے ٹکڑے مختلف رنگوں کے ہیں)

پس منظر سے کورس کی آواز

زندگی کا ترانہ

یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

ہوائیں مشک بار ہیں فضائیں زر نگار ہیں
اُفق کے کوہسار ہیں شفق کے آبشار ہیں
نجومِ شاخِ کہکشاں فلک کے برگ و بار ہیں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے

اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

ترانہ ہائے چنگ ہیں سرودِ موجِ گنگ میں
بتانِ آذری مچل رہے ہیں خشت و سنگ میں
سفینۂ آفتاب کارواں ہے نور و رنگ میں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

ہمالیہ کی چوٹیاں فلک سے ہم کنار ہیں
حقیر جن کے سامنے جہاں کے تاجدار ہیں
یہ ایشیا کی آبرو، یہ ہند کا وقار ہیں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

تڑپ رہی ہے موجِ بحرِ عشق ماہتاب میں
ہمیشہ کشمکش میں ہے ہمیشہ اضطراب میں
ہمیشہ سوز و ساز میں ہمیشہ پیچ و تاب میں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

نسیمِ صبح نکہتوں کے کارواں لئے ہوئے
شمیمِ گل سرورِ قلب وکیفِ جاں لئے ہوئے
سرور وکیف میکدے کی مستیاں لئے ہوئے
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

دمکتے عارضوں کا رنگ کاکلوں کی چھاؤں میں
مہکتے آنچلوں کا رقص ریشمی ہواؤں میں
لچکتے قامتوں کی تھرتھراہٹیں فضاؤں میں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

لبوں میں شہد انکھڑیوں میں رس شراب ناب کا
رباب زندگی پہ پہلا زمزمہ شباب کا
سبق دلوں کے مکتبوں میں عشق کی کتاب کا
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

جواں لبوں کی مسکراہٹوں میں گل فشانیاں

عرق عرق جبیں کی تابشوں میں کہکشانیاں
شکستِ حسن میں بھی فتحِ حسن کی کہانیاں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

چمن میں گونجتا ہے نغمہ بلبلِ حیات کا
شگفتہ اور رنگ ہو گیا گلِ حیات کا
طفولیت ہے معجزہ تسلسلِ حیات کا
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

ہزاروں قوتیں مچل رہی ہیں جوئبار میں
ہزاروں جلوے مسکرا رہے ہیں اک شرار میں
ازل سے بے قرار ہیں کسی کے انتظار میں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

ہیں ذرہ ہائے آتشیں سرشت کائنات میں
رواں انھیں کا گرم خون ہے رگِ حیات میں

مگر یہ قوّتیں ہیں آج آدمی کے ہات میں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

شکستہ ہے ہر ایک حلقہ قسمتوں کے دام کا
فضائے نیلگوں پہ سکّہ ہے بشر کے نام کا
یہ مہر و ماہ و مشتری؟ سفر ہے ایک گام کا
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

یہ برق و باد و رعد سب اسیر ہیں غلام ہیں
عمل کے میکدے میں کامرانیوں کے جام ہیں
وہ لمحے پختہ ہو رہے ہیں اب تلک جو خام ہیں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

سوار دوشِ کہکشاں یہ ہو رہا ہے آدمی
توہّمات کی سیاہی دھو رہا ہے آدمی
خوشی کی مے میں اپنے غم ڈبو رہا ہے آدمی

یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

مگر غلام قوم کی گھٹی ہوئی ہے زندگی
مثالِ شمعِ مفلسی بجھی ہوئی ہے زندگی
سیاہیوں کے درمیاں گھری ہوئی ہے زندگی

اگرچہ یہ جہانِ آب و گِل بہت حسین ہے
مگر غموں سے چور چور شیشۂ زمین ہے

(شور، نعرے، بندوقیں چلنے کی آوازیں۔)

مریم

ہر طرف شورِ محشر بپا ہے
شہر میں جانے کیا ہو رہا ہے

(داخل ہوتے ہوئے)

جاوید

تو کہ رنگین خوابوں میں کھوئی ہوئی ہے
اتنی غافل ہے گویا کہ سوئی ہوئی ہے

دیکھ اس ننّھی مُنّی سی جاں کو
جو ترے دل کے نیچے ترے نرم اور گرم پہلو کے گہوارے میں
بے خبر سو رہی ہے
جس کے جسم اور جاں کی ترے خون سے
پرورش ہو رہی ہے
جب وہ دنیا میں آئے گا تو ماں کی محبّت
ترے شفاف سینے سے اک دودھ کی نہر بن کر بہے گی
ترے شفاف سینے کی نوخیز کلیاں
جو محبّت کی راتوں میں کھل اُٹھتی تھیں پھول بن کر
نور سے جن کے دیوار و در جگمگا جاتے تھے
اور شرما کے چاند ابر میں منہ چھپا لیتا تھا
اب انھیں چھاتیوں میں تری ماں کلبلائے گی اور تو محبّت
سے بچّے کو آغوش میں کھینچ لے گی
اور وہ فرطِ مسرّت سے ننّھی سی باہیں اُٹھا کر
ڈال دیگا ترے چاند سے اس گلے میں کہ جس سے مرے گرم
بوسے گلوبند کی طرح لپٹے ہوئے ہیں
اور جب اپنے ہونٹوں سے، وہ پوپلے پیئے گا ترا دودھ
تو نو مہینے کی کاری مشقّت کی ساری تھکن
تری رگ رگ سے کھینچ آئے گی

اور تجھے
اپنی بھرپور اُٹھتی جوانی کا احساس ہو گا
جب وہ سوتے میں دیکھے گا، پریوں کے خواب
اور آہستہ سے، زیرلب مسکرائے گا، تو تجھ کو معلوم ہو گا، کہ ان ننھے
معصوم ہونٹوں میں، دنیا کے سارے خزانے سمٹ
آئے ہیں۔
پھر وہ جب گھٹنیوں چلنا سیکھے گا، اور ٹوٹے ٹوٹے ہوئے لفظ
تتلا کے بولے گا، تو تجھ کو محسوس ہو گا، کہ تخلیق
کا رقص و نغمہ، سمٹ کر تری گود میں آگیا ہے

یہ خوشی وہ ہے جس کے مقابل، زمانے کی جتنی بھی خوشیاں
ہیں سب ہیچ ہیں
لیکن اس ملک میں جس کو ہندوستاں کہتے ہیں
یہ خوشی بھی میسّر نہیں
ہر طرف کال کی آندھیاں چل رہی ہیں
خاک سے اُٹھ رہے ہیں وباؤں کے کالے بگولے
موت کی ڈائنیں چیختی اور چنگھاڑتی پھر رہی ہیں
مائیں بچوں کو آنچل کے نیچے چھپائے ہوئے خوف سے کانپتی ہیں
ان کے کانوں میں ہر سمت سے یہ بھیانک صدائیں چلی آ رہی ہیں

"سوکھ جائیں گے ماؤں کے شاداب سینے
اور بچّوں کے ہونٹوں سے اُڑ جائے گی مسکراہٹ
ریگ زاروں میں تبدیل ہو جائے گا یہ چمن
دُودھ کی جب میں نہریں رواں ہیں"
اور پھر تو بھی مریم
میری مریم
میرے بچّے کی ماں
تو بھی بنگال کی سیکڑوں عورتوں کی طرح اپنے روتے ہوئے
لال کو، دل کے ٹکڑے کو، سنسان راہوں کی جلتی
ہوئی خاک پر ڈال کر بھاگ جائے گی ان قحبہ خانوں
میں، جن میں کہ روٹی کے سوکھے ہوئے ایک ٹکڑے
کی خاطر جواں عصمتیں گوشت کے لوتھڑوں کی طرح
بک رہی ہیں۔
تیرے مظلوم بچّے کی چیخیں
دور تک تیری پرچھائیوں کا تعاقب کریں گی
خواب میں رُوح کو تیری آکر جھنجھوڑیں گی لیکن
تو کسی قحبہ خانے میں روٹی کے سوکھے ہوئے ایک ٹکڑے کی خاطر
اپنے دل، جسم اور رُوح کو بیچ دے گی
اپنے ہاتھوں سے خود اپنی ہی ماتا کا گلا گھونٹ دے گی۔

مریم - آہ! ظالم حکومت

جاوید

روٹیاں شاخِ طوبیٰ میں پھلتی نہیں
روٹیاں بادلوں سے برستی نہیں
وحی والہام بن کر اُترتی نہیں
روٹیاں، گندمی روٹیاں، سُرخ سونے کے ترشے ہوئے
گول ٹکڑے
چاند کی طرح گول اور سورج کے مانند گرم
آہ یہ روٹیاں آسمانوں میں پکتی نہیں
یہ ہیں انساں کے ہاتھوں کی تخلیق
اس کی صدیوں کی محنت کا پھل
چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ایک دہقاں
اپنے لکڑی کے ہل اور لوہے کے پھل سے
کھیت کو جوتتا ہے
اپنی آنکھوں میں صدیوں کی بیچارگی مفلسی اور تھکن لے کے آتا ہے
اور خاک سے پھوٹتی کونپلوں کو بڑے پیار
سے دیکھتا ہے
اپنے روتے بلکتے ہوئے شیر خواروں کا دکھ بھول کر
اپنے ہاتھوں سے، بڑھتے ہوئے سبز پودوں کو، اس شوق سے سینچتا ہے۔

جیسے وہ اس کی گودوں کے پالے ہوئے لال ہیں
اور پھر نرم شاخوں میں گیہوں کے خوشے
موتیوں کی طرح پھلتے ہیں
اور دہقان کی روح بیتاب ہو کر انھیں چومتی ہے
آسماں ناچتا ہے زمیں گھومتی ہے
کھیت کٹتے ہیں، کھلیان لگتے ہیں، پھر چکّیاں گاتی ہیں، لڑکیاں گاتی ہیں
کتنے ہی ہاتھوں میں لاکھ اور کانچ کی چوڑیاں گنگناتی ہیں
اور آگ کی آنچ میں تمتماتے ہیں رخسار
اس طرح گیہوں کے چاند سورج
گاؤں میں، شہر میں، ہر جگہ، جگمگاتے ہوئے چولھوں پر ناچتے ہیں
روٹیاں، گندمی روٹیاں، سرخ سونے کے ترشے ہوئے گول ٹکڑے
چاند کی طرح گول اور سورج کے مانند گرم
روٹیاں شاخِ طوبیٰ میں پھلتی نہیں
روٹیاں بادلوں سے برستی نہیں
وحی و الہام بن کر اترتی نہیں
یہ ہیں انساں کے ہاتھوں کی تخلیق

لیکن اس وقت انسان کے ہاتھوں کی پکی ہوئی روٹیوں کے لئے
عصمتیں بک رہی ہیں
عزّتیں بک رہی ہیں
گولیاں چل رہی ہیں
خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں
چکیّاں چپ ہیں، خاموش ہیں، گاؤں کی لڑکیاں، چوڑیاں
گنگناتی نہیں
کھیت کٹتے ہیں اب بھی
اور کھلیان لگتے ہیں اب بھی
لیکن اب گاؤں ویران ہیں
چور بازار کی رونقیں بڑھ رہی ہیں
لڑکیاں چکیّاں چھوڑ کر در بدر ٹھوکریں کھا رہی ہیں
اور دہقاں کی آنکھیں جو پتھرا رہی ہیں
اپنی صدیوں کی بے چارگی، مفلسی اور تھکن کو لئے
اپنے بچّوں کو فاقوں سے مرتے ہوئے دیکھتی ہیں
دیکھ تو ظالم انگریز کے راج میں ——
بھوک اور موت کے سائے میں ——
کتنے آزاد ہیں ہم

مریم
آہ ظالم حکومت
جاوید
دیکھ اپنے برہنہ بدن کو
نوجوانی کے دل کش چمن کو
جس پر افلاس رنگِ خزاں کی طرح چھا گیا ہے
تیرا پیوند اور چیتھڑوں کا یہ ملبوس سوکھی ہوئی پتیوں کی طرح ہنس رہا ہے۔
اور تو مجھ کو ایسی نظر آ رہی ہے
جیسے پت جھڑ کے موسم میں پھولوں کی روتی ہوئی ڈالیاں ہوں۔
ہم ہیں اس ملک کے رہنے والے
جس کے ڈھاکے کی ململ پہ دھوکا ہو آبِ رواں کا
ہم وہ تن زیب بُنتے ہیں جس سے جواں جسم کی جوت بادل سے چھنتی ہوئی چاندنی کی طرح پھوٹتی ہے
جامدانی کی نازک سُبک چولیاں
جن کے ہر تار میں مسکراتی ہیں بیلے کی کلیاں
اور اس سے زیادہ حسیں کامدانی کے آنچل
چھاؤں میں جن کی سوتے ہیں تارے
اور وہ کشمیر کے ریشمی پیرہن

جن پہ قربان سنجاب و دیبا و اطلس
گرچہ یہ سب ہیں ملبوس ہندوستاں کے مگر ہم غلاموں کو ان کے
پہننے کا حق ہی نہیں
ان کا اب ذکر بے کار ہے
دستکاروں کے زخمی انگوٹھے
ڈیڑھ سو سال سے ظلم کی داستاں کہہ رہے ہیں
ہم کو تو کارخانے کا لٹھا
چھینٹ کا ایک ٹکڑا
موٹے کھدر کا کُرتا
اور گاڑھے کا بھدّا کفن بھی میسّر نہیں
سر کھُلی عصمتیں پھر رہی ہیں
بے کفن میتیں سڑ رہی ہیں
ہاں مگر چور بازار میں "ونیش بھگتی" کے بوروں میں لپٹے ہوئے تھان
کے تھان رکھے ہوئے ہیں
دیکھ تو ظالم انگریز کے راج میں ——————
بھوک اور موت کے سائے میں ——————
کتنے آزاد ہیں ہم

مریم

آہ ظالم حکومت

جاوید

اپنے آبا و اجداد کی اس زمیں پر
اس بہشتِ بریں پر
ہم کو اب چین سے سانس لینے کا حق بھی نہیں ہے
دیکھتا ہوں میں جب اپنے گھر کو
اس کے دیوار و در کو
اس کی گرتی ہوئی ٹوٹی چھت کو تو محسوس ہوتا ہے یہ گھر نہیں جیل
کی کوٹھری ہے
جس کی دیواروں سے تیرگی رِس رہی ہے
یہ مکاں کیا ہے بیماریوں اور وباؤں کا گہوارہ ہے
اس کے کونوں میں ہر طرح کی لعنتیں پل رہی ہیں
لیکن ایسے بھی انسان ہیں جن کو یہ کوٹھری بھی میسّر نہیں ہے
اُن کے سر پر ہے چھت آسماں کی
اور چاروں طرف دُھوپ گرد اور بارش ______
غصّے میں پیچ اور تاب کھاتے عناصر کی دیواریں ہیں
کتنی ہی عورتیں کُتیوں اور بلیوں کی طرح اپنے بچّے گلی
کوچوں میں جن رہی ہیں
ہم سے بہتر ہیں کیڑے مکوڑے
ان کے سر پر ہری گھاس کے سائباں ہیں

سبز پیڑوں کی ٹھنڈی گھنی چھاؤں میں طائروں کے حسیں
آشیاں ہیں
سانپ بچھو بھی آرام سے رہتے ہیں اپنے اپنے بلوں میں
بھیڑیے اور گیدڑ پہاڑوں کے غاروں میں اور جنگلوں کے
درختوں کے نیچے
دھوپ گرد اور بارش سے بچ کر بڑے چین سے سوتے ہیں
لیکن انسان، معمار و خلّاق انسان
آج انگریز کے راج میں گھر سے بے گھر ہوا ہے
دستِ فطرت نے کہسار و دشت و بیاباں بنائے
آدمی نے گلستاں بنائے
اپنے بازو کی قوّت سے قصر اور ایواں بنائے
اس نے پتھر میں محراب کا لوچ ملینار کا حُسن پیدا کیا
اور دیواروں کو استقامت عطا کی
جن کے دروازے آغوشِ محبوب کی طرح وا ہو رہے ہیں
لیکن انگریز کے راج میں
ظالم انگریز کے راج میں
آج معمار و خلّاق انساں
گھر سے بے گھر ہوا ہے۔

مریم

آہ ظالم حکومت

جاوید

تیری ہم عمر کتنی ہی مائیں
کوئلے اور لوہے کی کانوں میں اپنی شکستہ جوانی سے لپٹی ہوئی
رو رہی ہیں
ان کے بچّوں کی معصومیت چھن چکی ہے
دیو ہیکل مشینوں نے لوہے کے دانتوں سے ان کی خوشی کو چبا
ڈالا ہے
دیو ہیکل مشینوں کو انسان نے سیکڑوں سال کی کشمکش اور مشقت
سے پیدا کیا ہے
تب کہیں جا کے لوہے کے یہ ہاتھ حاصل کیے ہیں
جن کی نبضوں میں بجلی کی لہروں کا خوں دوڑتا ہے
وہ اگر چاہیں کوہِ گراں کو اُٹھا لیں
کہکشاں کو زمیں پر بچھا لیں
کام کی لمبی گھڑیوں کو لمحوں میں تبدیل کر کے فراغت کی مدّت
بڑھا دیں
مفلسی اور بے کاری سب کچھ مٹا دیں
خاک کو سونا پتھّر کو پارس بنا دیں

لیکن ان آہنی ہاتھوں میں آج "سرمائے" نے چاندی کی
ہتھکڑی ڈال دی ہے
کارخانوں کے دل سے دُھواں اُٹھ رہا ہے
اور مشینوں کے اعصاب جکڑے ہوئے ہیں
سخت لوہے کی نبضوں میں بجلی کا خوں جم گیا ہے
اور بیمار "سرمایہ داری"
خون پی پی کے قے کر رہی ہے

مریم
آہ ظالم حکومت

جاوید
آج انسان کی ان کنیزوں —— مشینوں —— کی طاقت پہ
"سرمایہ داری"
کتنی اترا رہی ہے
وہ مشینوں سے انسان کے دل کو برما رہی ہے
اور فراغت نہیں بلکہ بیکاری پھیلا رہی ہے
کالے کالے دھوئیں کے گھنے بادلوں سے وہ دولت کے موتی
نہیں مفلسی کے جراثیم برسا رہی ہے
دیکھ کس طرح مزدور جو جسم پر پیرہن کی جگہ اپنی ہی کھال پہنے
ہوئے پھر رہے ہیں

صبح سورج کی پہلی کرن پھوٹتے وقت اپنے اندھیرے بلوں
سے نکلتے ہیں اور کارخانوں میں جاکر
اپنا اور اپنے بچوں کے دل کا لہو بادۂ ارغوانی میں تبدیل کر کے
خون آشام سرمائے کے جام میں ڈالتے ہیں
شام کو کارخانے اُگل دیتے ہیں اُن کو جھلسی ہوئی راکھ کا ڈھیر
کر کے

اور پھر رات کے وقت طاعون، دق اور سل کے یہ بھوت
موت کے بھیڑیوں کی طرح آتے ہیں اور بھوکے دلوں اور سوکھی
ہوئی ہڈیوں کو چبا ڈالتے ہیں
دیکھ تو ظالم انگریز کے راج میں ————
بھوک اور موت کے سائے میں ————
کتنے آزاد ہیں ہم

مریم

آہ ظالم حکومت

جاوید

آج "سرمایہ داری" وہ چنچل حسینہ نہیں جس کی بیبا کی پر بوڑھی
"جاگیر داری" خفا تھی
جو ہواؤں سے لڑتی تھی طوفان سے کھیلتی تھی
جو سمندر میں دھوتی تھی زُلفیں

گوندھ کر ان میں سورج کی کرنیں
صبح سے شام تک ناچتی تھیں
اجنبی دیس کے اجنبی ساحلوں پر
قہقہے مارتی تھی
آج "سرمایہ داری"
بوڑھی قحبہ ہے، دلاّلی ہے پیشہ اُس کا
اب وہ اک سانس لیتی ہوئی لاش ہے
سالہا سال سے سڑ رہی ہے
قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوئی ہے
اس نے اپنی جوانی میں اپنی غلط کاریوں سے
کتنے بچّے جنے ہیں
بھوک، بیکاری، افلاس، قحط و وبا، جہل، وہم، آتشک، بلینک
زہریلی گیس اور ایٹم کے بم اس کے گودوں کے پالے
ہوئے ہیں
اب یہ بچّے جواں ہو گئے ہیں
زندگی کے لئے اک بلا ہو گئے ہیں
اور "سرمایہ داری" کی بوڑھی چھنال ان کی طاقت سے انسانیت
کا لہو پی رہی ہے

مریم
ظلم اور جبر پر چی رہی ہے

جاوید
آج ہندوستان میں کوئی خوش نہیں ہے
پیٹ کو روٹی، ہاتھوں کو کام اور تن ڈھانکنے کے لئے چیتھڑے بھی نہیں ہیں
خالی جو ہاتھ ہوں گے وہ بے کار کب تک رہیں گے؟
اک نہ اک روز تلوار پر جائیں گے
ہونٹ خاموش رہتے نہیں
وہ محبت کے بوسوں اور آسودگی کے ترانوں سے محروم ہوں گے تو مجبور ہو کر
انقلاب اور بغاوت کے چھیڑیں گے نغمے
اور آزادی کے زمزمے گائیں گے
آج ایک ایک دریا میں طوفان ہے
کوہساروں کے سینے میں ہیجان ہے
ذرّہ ذرّہ بغاوت پر آمادہ ہے
سیکڑوں اور ہزاروں مجاہد قدم سے قدم کو ملائے ہوئے بڑھ رہے ہیں
گولیاں سنسناتی ہیں اُڑتے ہیں پرچم

بادشاہی کے گھر میں ہے ماتم
موت کی چھاؤں میں زندگی رقص فرما رہی ہے

مریم

مرحبا

جاوید

عہدِ نو آ رہا ہے
دولتیں، برکتیں، راحتیں، لذّتیں لا رہا ہے
خاک کے بطن میں اَن جنی کونپلیں ناچتی ہیں
کھیتیاں لہلہانے کو بے تاب ہیں
گیہوں اور دھان کی نرم ناپید اشاخیں
رنگ اور نور میں کھیلنے کے لئے مضطرب ہیں
خاک چلاّ رہی ہے کہ "جاگیردار اور زمیندار نے اپنے ناپاک،
قدموں سے مجھ کو نجس کر دیا ہے"

خارزار اور بنجر زمینیں
کہہ رہی ہیں کہ "گنگا کے پانی سے دھو دو ہمیں
پاک اور صاف کر دو ہمیں
تاکہ ہم اپنے مخمل کے پیراہنوں کو پہن کر
جشنِ صبحِ بہاراں منائیں"

اور دھرتی کے سینے میں کانوں کے اندر
کتنی دھاتیں ہیں جو کروٹیں لے رہی ہیں
ان کے جوہر میں جنبش ہے اور دل میں ارمان یہ ہے
"کوئی آکر ہمیں قیدِ فطرت سے آزاد کر دے
ہم مشینوں کی صورت میں انسان کی خدمت کریں گے"
ان کی آنکھوں میں اک خواب لہرا رہا ہے
ریشم اور سوت کے کارخانے
ابر کی طرح دُھنکی ہوئی روئی کے نرم گالے
ناچتی چرخیاں، گنگناتی ہوئی تکلیاں، سینکڑوں رنگ
کے تانے بانے
جیسے سورج کی رنگین کرنیں
اپنی لاکھوں لچکتی ہوئی اُنگلیوں سے
آسمانوں پہ قوس قزح کی حسیں چادریں بُن رہی ہوں

ملک کے سنگ اور خشت میں
سرخ پتھر کی اونچی چٹانوں کے دل میں
کتنی محرابیں انگڑائیاں لے رہی ہیں
کتنے دیوار و در، کتنے مینار جو سنگ مرمر کے سینے میں سوئے
ہوئے ہیں

جو عدم کے اندھیرے میں کھوئے ہوئے ہیں
آج انسان کے دستِ تعمیر کے منتظر ہیں
کاش صنّاع و معمار انھیں ان کے خوابِ گراں سے جگادیں
سنگ اور خشت کے ڈھیر کو قصر و ایواں بنادیں
ہم اجنتا کے نقاش، بت گر ایلورا کے معمار ہیں تاج اور
سیکری کے
ہم وہ صنّاع ہیں انگلیاں جن کی پتھّر کو بھی موم کر کے سبک اور
حسیں شکل میں ڈھالتی ہیں
لیکن ان انگلیوں کو
ڈیڑھ سو سال کی مفلسی اور غلامی ——
ڈیڑھ سو سال کی کوڑھ نے کھالیا ہے

آج ہندوستاں جاگ اُٹھا ہے
یہ حسیں بوستاں جاگ اُٹھا ہے
اس کی انسانیت اور رُوحانیت جاگ اُٹھی ہے
بچّے گہواروں سے رینگ کر آج باہر نکل آئے ہیں
اور انگریز سے اپنا کھویا ہوا بھولاپن مانگتے ہیں
عورتیں اپنی کھوئی ہوئی عصمتیں
مائیں بے آب سینوں کی شادابیاں مانگتی ہیں

دستکار اپنے مضبوط انگوٹھے
اور صنّاع و معمار اپنی سبک انگلیاں مانگتے ہیں
جنگ آزادی میں لڑنے والے سپاہی
کارخانوں کے مزدور کھیتوں کے دہقاں
اپنے دریا و دشت و جبل اپنا اک وطن مانگتے ہیں
یہ حسیں بوستاں ہے ہمارا
سارا ہندوستاں ہے ہمارا
ہم اس اپنے وطن، اپنے گلزار میں، اور کچھ بھی نہیں، صرف
جینے کا حق مانگتے ہیں۔

چوتھی تصویر

آج سے کوچہ و بازار میں مرنا ہے روا
ظلم کی چھاؤں میں چُپ بیٹھ کے جینا ہے حرام

جعفری

چوتھی تصویر

تاریخ کا ترانہ

میں نے لاکھوں بہاریں دیکھی ہیں
آگ کے پھول، آگ کے گلزار
انکھڑیوں کے دَہکتے انگارے
آہ کے شعلے آنسوؤں کے شرار

روم و یونان کے غلام اُٹھے
شیر پنجروں سے جیسے چھوٹ گئے
ظالموں کے محل لرزنے لگے
ہاتھ تھرّائے، جام ٹوٹ گئے

آج تک گونجتے ہیں کانوں میں
ہم ہمے جا گتے کسانوں کے
رُوح میں میری زخم ہیں پنہاں
عہدِ وسطیٰ کے باغبانوں کے

میں نے دیکھیں طلوع ہوتی ہوئی
غازیوں کی حسین تلواریں
میری آنکھوں کے سامنے بیٹھیں
محبسوں کی بلند دیواریں

میری نظروں کے سامنے گزرے
انقلابِ فرانس کے پرچم
میرے سینے پہ ثبت ہیں اب تک
باغیوں کے جوان نقشِ قدم

میری نبضوں میں، میرے خون میں ہے
جوشش زن والگا کا سُرخ اُبال
نور افشاں ہے میرے ماتھے پر
روس کے انقلابیوں کا جلال

میں نے لاکھوں بہاریں دیکھی ہیں
آگ کے پھول، آگ کے گلزار
انکھڑیوں کے دہکتے انگارے
آہ کے شعلے، آنسوؤں کے شرار

وقت کا ترانہ

تو نے لاکھوں بہاریں دیکھی ہیں
اب کی اس ملک کی بہار ہے اور
وادیاں گونجتی ہیں نعروں سے
سازِ آہنگِ آبشار ہے اور

قافلہ انقلاب کا ہے رواں
بج رہی ہے خوشی کی شہنائی
زلزلوں سے دہل رہی ہے زمین
لے رہے ہیں پہاڑ انگڑائی

سلگ اُٹھی ہے انتقام کی آگ
برف کی چوٹیاں دہکتی ہیں
ظلم اور جبر کے اندھیرے میں
سیکڑوں بجلیاں چمکتی ہیں

جن کو کچلا گیا ہے صدیوں سے
آج تک اُن کے دل دھڑکتے ہیں
زندگی کے بجھے ہوئے شعلے
اک نئی شان سے بھڑکتے ہیں

فصل کے ساتھ کھیتوں سے
اُگ رہی ہے بغاوتوں کی سپاہ
جگمگاتی ہے عدل کی شمشیر
مل سکے گی نہ ظالموں کو پناہ

کارخانوں کے آہنی دل سے
ایک سیلاب سا اُبلتا ہے
سُرخ پرچم ہوا کے سینے پر
بن کے رنگِ شفق مچلتا ہے

یہی ہندوستاں کا ساحل ہے
جس پہ ٹوٹا غرورِ سلطانی

آگ سی لگ گئی ہے پانی میں
موجیں کرتی ہیں شعلہ افشانی

بادباں کھُل گئے بغاوت کے
بمبئی کے جہازیوں کو سلام
جو شہنشاہیت سے ٹکرائے
ایسے جاں باز غازیوں کو سلام

دیدنی اہلِ شہر کا ہے شکوہ
گولیاں روکتے ہیں سینوں پر
لب پہ نعرے، نگہ میں عزمِ جہاد
حُرّیت ضوفگن جبینوں پر

ہر سڑک پر سمندروں کا اُبال
ہر گلی میں ہے جوشِ طوفانی
غرق کر دے گی بادشاہی کو
آدمی کے لہو کی طغیانی

خون چہرے پہ مل کے اُٹھی ہے

یہ ہے کشمیر کی دُلھن کا سہاگ
ہر کلی بن گئی ہے چنگاری
شاخِ گُل سے نکل رہی ہے آگ

اِن حسیں زعفران زاروں میں
یوں تو ہر سال پھُول آتے ہیں
اِس برس کاسنی شگوفوں میں
زخم ہی زخم مسکراتے ہیں

جھیل ہے یہ کنول کے پھُولوں کی
پاک اور صاف اس کا پانی ہے
مِل گیا ہے لہو شہیدوں کا
آج ہر موج ارغوانی ہے

ہے یہ عرصہ گہہ بڑا و نکور
ناز کر ناز سرزمینِ دکن
رقص کر رقص موجِ بحرِ عرب
مُسکرا اے بہادروں کے وطن

وہ اُٹھیں ایک لاکھ بندوقیں
گولیاں ایک لاکھ چلنے لگیں
جھپٹے وہ ایک لاکھ متوالے
ایک لاکھ آندھیاں مچلنے لگیں

رہ گئیں ایک لاکھ سینوں میں
ٹوٹ کر ایک لاکھ شمشیریں
گر گئیں ایک لاکھ جسموں سے
ٹوٹ کر ایک لاکھ زنجیریں

حیدرآباد کے جوانوں کی
فوج میدان میں اُتر آئی
پھر سے ٹیپو کی تیغ جوہر دار
خون میں ڈوب کر اُبھر آئی

بجلیوں کی طرح کڑکتی ہوئی
ٹولیاں آگئیں کسانوں کی
کیا گھٹا جھوم کر برستی ہے
گونج ہے فتح کے ترانوں کی

شور ہے جوش ہے، تلاطم ہے
اُڑ گئے ہوش حکمرانوں کے
جاگ اُٹھے ہزار جوالامکھی
آگ اُبلنے لگی دہانوں سے

اک طرف ظلم، اک طرف انصاف
فوج سے فوج آ کے ٹکرائی
جن کے دل میں تھا جوش قربانی
آج ان کی مراد بر آئی

بہہ رہے ہیں جوان جسموں سے
سُرخ اور گرم خون کے دھارے
پھُوٹ نکلے افق کے سینے سے
روشنی کے طلسمی فوّارے

یہ انھیں عورتوں کی لاشیں ہیں
جن کے چہروں پہ رنگ تھا نہ نکھار
آج دامن میں کھل رہے ہیں چمن

آنچلوں میں ٹکی ہوئی ہے بہار

خاک پر سو رہے ہیں جو بچّے
اپنے ہی خون میں نہائے ہوئے
"ٹامیوں" کو شدید نفرت سے
دیکھتے ہیں نظر جمائے ہوئے

یہ ہیں وہ لال جو نشانی تھے
اپنے ماں باپ کی محبت کے
آج سے یادگار ہیں لیکن
ملک اور قوم کی شجاعت کے

مجھ سے کیا پوچھتی ہے اے "تاریخ"
کیا ہے ہندوستان کا تحفہ؟
اس دہکتے ہوئے گلستاں سے
ایک دو سرخ پھول لیتی جا

فرنگی

تم کو معلوم ہے یہ جگہ کون سی ہے؟

جاوید
نہیں
فرنگی

یہ وہ ایوان ہے جس میں انصاف، عدل اور صداقت
کی قندیل
سیکڑوں سال سے جل رہی ہے
یہ وہ ایوان ہے جس کے سائے میں ہندوستان کی
رعایا
امن اور چین سے پل رہی ہے
دیکھو دیوار پر شاہِ برطانیہ اور شہنشاہ ہندوستاں کی
شبیہہ مبارک لگی ہے
جس کی آنکھوں میں رحم اور دل میں محبت بھری ہے
اس کے نزدیک آؤ
ہاتھ اُٹھاؤ
اور قسم کھاؤ سچ بولنے کی

مریم

پہلے تم یہ بتاؤ کہ سچائی کی تاب بھی لا سکوگے؟

جاوید

سچ تو یہ ہے کہ انصاف، عدل اور صداقت کی قندیل
ایوانِ شاہی میں روشن نہیں ہے

مریم

سچ تو یہ ہے کہ انگریز کے ہاتھ میں سچ کا دامن نہیں ہے
پتھروں کو پگھلتے ہوئے، ریگزاروں میں پھولوں کو کھلتے
ہوئے ہم نے دیکھا نہیں ہے

جاوید

سچ تو یہ ہے کہ اب کوئی ہندوستانی
شاہِ برطانیہ کی رعایا نہیں ہے

مریم

سچ تو یہ ہے کہ انگریز کے ڈیڑھ سو سال کے راج میں
ایک انساں نے بھی امن اور چین پایا نہیں ہے

جاوید

سچ تو یہ ہے کہ یہ اجنبی شخص جس کی شبیہِ مبارک یہاں
لاش کی طرح لٹکی ہوئی ہے
یہ نہ تو شاہِ برطانیہ ہے نہ شاہنشہِ ملکِ ہندوستاں ہے
اک فریب، ایک دھوکا ہے، اک وہم ہے، اک
گماں ہے

فرنگی

چپ رہو چپ رہو شاہِ برطانیہ کے غلامو
چپ رہو
اپنا اعمال نامہ سنو
تم نے ــــ جاوید و مریم
تم نے جمہور کے ساتھ مل کر
انقلاب اور بغاوت کا فتنہ جگایا
تم نے ایک ایک کونے میں طوفاں اُٹھایا
تم یہ کہتے ہو جمہور کا راج ہو
ایک ایک گھر میں سوراج ہو
کھیتیوں میں کسانوں کی ہو حکمرانی
کارخانے ہوں مزدور کی راجدھانی
تم پر الزام یہ ہے کہ تم
شاہِ برطانیہ اور شہنشاہ ہندوستاں کی حکومت
سلطنت اور قانون ہی کے نہیں
امن و تہذیب و اخلاق کے بیخ کن ہو
مختصر یہ کہ تم بد چلن ہو

جاوید

جانتے ہو ہماری نگاہوں میں تم کون ہو؟

عصرِ حاضر کے فرعون ہو!
تم وہ قاتل ہو گردن پہ جن کی
ایک دو کا نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں کا خون ہے
تم وہ پاپی ہو کہ پاپ بھی شرم سے سرنگوں ہے

جب تم اس ملک میں آئے تھے ہم نے مہماں سمجھ کر
اپنی آنکھوں پہ تم کو بٹھایا
بھائی کہہ کر گلے سے لگایا
تم مگر مکر اور فن میں استاد نکلے
بھیس سوداگروں کا بنایا تھا در اصل جلاّد نکلے
بھائی سے بھائی کو تم نے آکر لڑایا
خون پانی کی صورت بہایا
اور پھر اپنے آئین و قانون کے نام پر
اونچے قلعے بنائے
فوج لائے
میزبانوں پہ پہرے بٹھائے
ظلم اور جبر کے تازیانے لگائے
اور ہندوستاں کی بھری بستیاں لوٹ لیں
تم وہ ہو جن کے ہاتھ اپنے ہی محسنوں کے لہو میں بھرے ہیں

تم تو خود جانتے ہو کہ جس شے کو آئین و قانون کا نام تم نے
دیا ہے وہ کیا ہے
یہ ہے وہ سانپ جو سیکڑوں سال سے ایشیا اور افریقہ
کو ڈس رہا ہے
جس کو لندن کے شاہی مداری
اپنی مکاریوں کی پٹاری میں لے کر
ایک اک ملک میں ایک اک دیس میں پھر رہے ہیں
یہ وہ کوڑا ہے جس کے لگائے ہوئے زخم انسان کے جسم
اور روح میں سڑ رہے ہیں
یہ وہ بجلی ہے جو سالہا سال سے مفلسوں کے گھروں پر
گر رہی ہے
یہ وہ تلوار ہے جو نہتّوں کی سوکھی ہوئی گردنوں پر
ڈیڑھ سو سال سے پھر رہی ہے
یہ وہ مخمل ہے جس میں تمہارے تشدّد کے خونخوار پنجے چھپے
ہیں
اپنے قانون کا ڈھونگ اچھّا رچایا ہے تم نے
جابرانہ حکومت کا اچھّا بہانہ بنایا ہے تم نے
لیکن اس ملک میں ایسے قانون کی دھجیاں
اُڑ چکی ہیں

ہم نے اپنے تڑپتے ہوئے دل کے جلتے ہوئے خون سے اپنی
بے غیرتی اور محکومیت کی سیاہی کو دھو
ڈالا ہے
اب یہاں ایک آئین ہے ایک قانون ہے
جس کو جمہور نے انقلاب اور بغاوت کی بھٹی میں پگھلا کے اپنے
عزم کے سانچے میں ڈھالا ہے

فرنگی

اور جاوید کی بیوی مریم
تم کو کیا کہنا ہے؟

مریم

جب سے تم آئے ہو گھر کی سب برکتیں اٹھ گئی ہیں
تم نے ہندوستاں کی لہکتی ہوئی کھیتیوں سے
ان کی زرخیزیاں چھین لی ہیں
تم نے اس ملک کے سبزہ زاروں کی شادابیاں چھین لی
ہیں
تم نے پھولوں کو کھلنے، ہواؤں کو چلنے سے روکا
تم نے چشموں کو بہنے سے، فواروں کو رقص کرنے سے روکا
اور دریاؤں میں زہر گھولا

کل جہاں ناچتی تھیں بہاریں
دودھ اور شہد کی پڑ رہی تھیں پھواریں
آج ان وادیوں اور میدانوں میں قحط و افلاس کے بھوت
منڈلا رہے ہیں
اور آئین و قانون کے گِدھ ہمارے
جسم کی بوٹیاں نوچ کر کھا رہے ہیں

تم کو معلوم ہے آج کیوں نوجواں عارضوں کے کنول مسکراتے
نہیں ہیں؟
چاند سے ماتھے، سورج سے مکھڑے
کس لئے جگمگاتے نہیں ہیں؟
تم نے بچپن کے پھولوں سے خوشبو چُرالی
اور جوانی کے آئینے سے اس کی رونق اُڑا لی
تم نے ہنستی ہوئی مانگ اور مسکراتی جبینوں سے افشاں چھڑالی
صندلی ہاتھوں سے ان کا رنگِ حنا لے لیا ہے

جاوید

پھر بھی تم امن و تہذیب و اخلاق کا نام لے کر
اک نیا جال پھیلا رہے ہو
ساری دنیا کو بہکا رہے ہو

مریم

خود ہی اپنے گریباں میں منہ ڈال کر پوچھ لو
امن و تہذیب کا نام کس نے مٹایا
کس نے دکھیاری ماؤں کے کڑیل جوانوں کو توپوں کا ایندھن
بنایا
کس نے شہروں کو اور بستیوں کو جلایا
کس کے بمبار برسوں سے دُنیا کے سر پر
موت کی راگنی گا رہے ہیں
کس کے لشکر ہیں جو غیر ملکوں میں طاعون پھیلا رہے ہیں

خود ہی اپنے گریباں میں منہ ڈال کر پوچھ لو
کس نے قبروں کو کھودا
اور لاشوں کو باہر نکالا
کس نے لاشوں کے ٹکڑے کئے کس نے مُردوں کے کوڑے
لگائے
کس نے آئین و قانون کے نام پر سولیاں گاڑ دیں
اور پھانسی کے پھندے بنائے
کس نے ماؤں کی گودوں سے بچّوں کو چھینا
چیر کر کس نے معصوم بچّوں کا سینہ

نرم، نازک، دھڑکتے دلوں کو چھپایا

خود ہی اپنے گریباں میں منہ ڈال کر پوچھ لو
ملک میں انقلاب اور بغاوت کا طوفان کس نے اُٹھایا
تم جسے جُرم کہتے ہو وہ اصل تہذیب ہے اصل اخلاق ہے
ظالموں کے خلاف انقلاب اور بغاوت
آدمیت کی معراج ہے
آدمیت کی معراج ہے

جاوید
ہم کو اپنی غلامی گوارا نہیں
ایک بھی ذرّہ اس ملک میں اب تمھارا نہیں
آج پیڑوں کے پیروں میں جنبش ہے کہسار چلنے لگے ہیں
ریگ زاروں کے سوکھے ہوئے زرد سینوں سے سیلاب
اُبلنے لگے ہیں
کھیتیاں خاک کی گود سے اُٹھ رہی ہیں
اب کی سال ان کی شاخوں میں ہنسیے پھلے ہیں
کارخانے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں ہتھوڑے
اُٹھائے ہوئے آ رہے ہیں
اور لوہے کے پہیے۔

وقت و تاریخ کے تیز رفتار پہیوں کے مانند
انقلاب اور بغاوت کی رتھ نیں لگے فتح کی راگنی گا رہے ہیں

دیکھو کتنی ہی فوجیں اُفق سے
آندھیوں کی طرح آ رہی ہیں
بجلیاں ظلم کے سر پہ منڈلا رہی ہیں
بل پہ بل کھا رہی ہیں
یہ وہ روحیں ہیں جو رود کاویری کے ساحلوں پر
اور پلاسی کے میدان میں سینکڑوں سال
سے سو رہی ہیں
یہ وہ اجسام ہیں غدر کے وقت جن کو
اپنی توپوں سے باندھا تھا تم نے
یہ وہ لاشیں ہیں جن سے ہزاروں کنوؤں اور گڑھوں کو پاٹا
تھا تم نے
یہ وہی سر ہیں تم نے جنھیں گردنوں سے جدا کر دیا تھا
یہ وہی گردنیں ہیں جنھیں تم نے پھانسی کا پھندا دیا تھا
یہ وہی ہاتھ ہیں جن میں اب تک
آہنی ہتھکڑی کے نشاں ہیں
یہ وہی پیر ہیں جن میں اب تک بیڑ

ہماری بیخانی ہوئی

بیڑیاں ہیں
یہ وہی سینے ہیں جن میں دل کی جگہ سیسے کی گولیاں سو
رہی ہیں
یہ وہی دل ہیں جن کے ہر اک زخم میں زہر آلود سنگینوں کی
ٹوٹی نوکیں پڑی رو رہی ہیں

دیکھو کتنی ہی فوجیں اُفق سے
آندھیوں کی طرح آ رہی ہیں
بجلیاں ظلم کے سر پہ منڈلا رہی ہیں

بھاگو بھاگو
اپنا جسم، اپنی جان، اپنا امن، اپنا اخلاق و تہذیب و
قانون سب لے کے بھاگو
اس زمیں کے دہکتے ہوئے سینے سے سلطنت کی پُرانی
بساط اب اُٹھا لو
زندگی تم سے تنگ آ چکی ہے
ساری دُنیا اب اُکتا چکی ہے
موت کے بادباں کھول دو اور اپنے جہازوں کے لنگر
اُٹھا لو

جاؤ۔ جاؤ

فرنگی

اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تم کو
اپنے سارے جرائم کا اقرار ہے

جاوید

ہم کو انکار ہے

مریم

ہم کو انکار ہے

فرنگی

پر یہ قانون کی منصفانہ نگاہوں میں اقرار ہے

جاوید

انقلاب اور بغاوت کا اقرار لیکن جرائم سے انکار

مریم

انکار ہے

فرنگی

تم اسی طرح انکار کرتے رہوگے
پھر بھی قانون کا فیصلہ، فیصلہ ہے
تم نے —— جاوید و مریم
تم نے جمہور کے ساتھ مل کر

انقلاب اور بغاوت کا فتنہ جگایا
تم نے ایک ایک کونے میں طوفاں اُٹھایا
تم یہ کہتے ہو جمہور کا راج ہو
ایک اک گھر میں سوراج ہو
کھیتیوں میں کسانوں کی ہو حکمرانی
کارخانے ہوں مزدور کی راجدھانی

تم پر الزام یہ ہے — کہ تم
شاہِ برطانیہ اور شہنشاہِ ہندوستان کی حکومت
سلطنت اور قانون ہی کے نہیں
امن و تہذیب و اخلاق کے بیخ کن ہو
اس لئے شاہِ برطانیہ اور شہنشاہ ہندوستان کی عدالت
سے تم کو
تم کو جاوید
یہ سزا دی گئی ہے کہ سرکار نے تم سے جینے کا حق لے لیا ہے

جاوید

مجھ سے کیا، سارے ہندوستان سے یہ حق، جب سے تم
آئے ہو چھن چکا ہے

فرنگی

.. .. تم سے جینے کا حق لے لیا ہے

اب تمہارے لئے قید خانے میں ریشم کا پھندا لگا ہے
تاکہ اس میں تمہارا گلا باندھ کر تم کو پھانسی پہ لٹکایا جائے یہاں
تک کہ دم توڑ دو
شاہِ برطانیہ اور شہنشاہِ ہندوستان کی
سلطنت چھوڑ دو

جاوید

اور تم ہم غریبوں کے ہندوستان کی
مملکت چھوڑ دو

فرنگی

اور تم کو
تم کو مریم
یہ سزا دی گئی ہے کہ تم عمر بھر
عمر بھر صرف رویا کرو
اپنے اشکوں سے اپنے گناہوں کو دھویا کرو
یہ وہ ایوان ہے جس میں انصاف عدل اور صداقت
کی قندیل
سیکڑوں سال سے جل رہی ہے
یہ وہ ایوان ہے جس کے سائے میں ہندوستان کی
رعایا

امن اور چین سے پل رہی ہے

مریم

ایسے ایوانِ عدل و صداقت پہ لعنت
ایسی ظالم حکومت پہ لعنت

(دیر تک آواز گونجتی رہتی ہے)

لعنت، لعنت، لعنت

پانچویں تصویر

آج کی رات اور باقی ہے

مجاز

پانچویں تصویر

موت کا راگ

ہر چیز آنی، ہر چیز جانی
ہر رنگ فانی، ہر نقش فانی
دُنیا پریشاں خوابوں کی بستی
رنگیں فسانہ، غمگیں کہانی

سازِ ازل کا نغمہ اجل ہے
شمعِ جہاں کا جلوہ اجل ہے
رقصاں اجل کی پرچھائیاں ہیں
پنہاں اجل ہے پیدا اجل ہے

نکہت ہو گل کی، تاروں کی ضَو ہو
مَوجِ نظر ہو، بجلی کی رَو ہو
چلتا ہے سب پر جادو اجل کا
نقشِ کُہن ہو، یا نقشِ نَو ہو

ہر پھول بے بس، ہر خار بے بس
ہر ساز بے بس، ہر تار بے بس
پنجے سے میرے کوئی نہ چھوٹا
تسبیح بے بس، زُنّار بے بس

آنکھوں کا کاجل اشکوں سے دھویا
میں نے خوشی کو غم میں بھگویا
بچ کر نہ نکلا کوئی سفینہ
سب کو ڈبویا، سب کو ڈبویا

قیدی ہیں گورے، قیدی ہیں کالے
انسان و حیواں میرے نوالے
محفل میں میری کرتے ہیں گردش
خوں کے پیالے، خوں کے پیالے

چنگیز و تیمور، نشتر ہیں میرے
خاقان و فغفور خنجر ہیں میرے
میرے پھریرے قحط اور وبائیں
ظلم اور افلاس لشکر ہیں میرے

مجھ کو زمانہ کہتا ہے سفّاک
میری نگاہیں سرد اور بے باک
ہر وار بھرپور، ہر وار بھرپور
دستِ اجل ہے چست اور چالاک

لیکن فرنگی میرا بھی استاد
مجھ سے بھی بڑھ کر سفّاک و جلّاد
سہمی ہوئی ہے دیوارِ زنداں
پھانسی کے پھندے کرتے ہیں فریاد

مریم کی آواز

زندگی ایک بارِ گراں ہے

میرا جاوید آخر کہاں ہے؟

جاوید

آ مرے پاس آ میری مریم
میری غم خوار و دل دار و ہمدم
میں سلاخوں کے پیچھے کھڑا ہوں
راہ کب سے تری تک رہا ہوں

(مریم سامنے آتی ہے)

فرض اپنا ادا کر چکا ہوں
دامن شوق کو بھر چکا ہوں
بوجھ کوئی نہیں قلب و جاں پر
فخر کرتا ہوں ہندوستاں پر
میرے دل میں نہ ڈر ہے نہ غم ہے
آنکھ تیری محبت میں نم ہے
دل میں بس ایک ہی آرزو تھی
دیکھ لیتا بھری گود تیری

مریم

(آگے بڑھ کر)

کوئی دیوارِ زنداں کو ڈھا دے
اِن سلاخوں کو پیچھے ہٹا دے

(سلاخوں کو زور سے ہلاتی ہے)

جاوید

کیوں یہ آنکھیں تری لال کیوں ہیں ؟
اتنے اُلجھے ہوئے بال کیوں ہیں؟
کیوں ہے غمگین صورت بنائی؟
رُخ پہ کیوں اُڑ رہی ہے ہوائی؟
نظریں اِس طرح کیوں بُجھ گئی ہیں؟
ہاتھ میں چوڑیاں کیوں نہیں ہیں؟
تیرے چہرے پہ افسردگی ہے
تیرے لہجے میں پژمردگی ہے

مریم

میرے دل میں محبت ہے تیری

جاوید

تیرے ہی ہاتھ عزّت ہے میری
روک لے آنسوؤں کی روانی
پھیر قربانیوں پر نہ پانی

مریم

تجھ سے کہتی ہوں پھیلا کے آنچل
مجھ کو بھی اپنے ہی ساتھ لے چل

جاوید

مجھ کو مت دیکھ، دیکھ اس چمن کو
لُٹ گئی ہے، جو اس انجمن کو
دیکھ اے جانِ ہندوستاں کو
اپنے اُجڑے ہوئے بوستاں کو
جس کے ہر گل پہ رنگِ خزاں ہے
جس کا ہر برگ و بر نوحہ خواں ہے
گھِر کے آئے اگر ابرِ باراں
خاک سے پھُوٹے رنگِ بہاراں
آنسُوؤں کی نہیں کوئی حاجت
اس کو ہے گرم خوں کی ضرورت

مریم

میرے سر میں بھی آخر جنوں ہے
میری نبضوں میں بھی گرم خوں ہے
موت کا مجھ کو پیغام آتا
کاش میرا لہو کام آتا

جاوید

سُرخ رُو ہوگی اک روز تو بھی
کام آئے گا تیرا لہو بھی

یوں گزرنا ہی سب کچھ نہیں ہے
صرف مرنا ہی سب کچھ نہیں ہے
اور بھی ہیں بہت سے طریقے
خدمتِ ملک و قوم و وطن کے

مریم

جا کے دوں کس کے در پر دہائی
شاق ہے مجھ کو تیری جدائی
آہ کل تو بہت دُور ہو گا
میری نظروں سے مستور ہو گا
سوگ چھا جائے گا زندگی پر
اوس پڑ جائے گی ہر خوشی پر
دُکھ اُٹھاؤں گی صدمے سہوں گی
عمر بھر اب اکیلی رہوں گی
مجھ کو ہر وقت یاد آئے گا تو
میرے خوابوں میں لہرائے گا تو
آنسوؤں میں چمکتا رہے گا
میرے دل میں دھڑکتا رہے گا
شرم ہے اپنی ناکامیوں پر
فخر ہے تیری قربانیوں پر

لیکن اس دل کو سمجھاؤں کیسے
میں تجھے چھوڑ کر جاؤں کیسے
جشنِ نَو آئے گا جب وطن میں
ہوں گی تنہا بھری انجمن میں

جاوید

کل کا انداز کچھ اور ہوگا
بزم میں اک نیا دور ہوگا
جنگ ہوگی نہ بیکار ہوگی
تو مسرّت سے سرشار ہوگی
گود میں تیری اک چاند ہوگا
جس سے خورشید بھی ماند ہوگا
جب جوانی کا انعام پانا
اس کو میری طرح کا بنانا
اس طرح مجھ کو پا جائے گی تو
پھر نہ اک پل بھی گھبرائے گی تو
کتنی دلچسپ ہے یہ کہانی
مٹ کے بنتی ہے پھر زندگانی

ساری انسانیت اک تڑپتا ہوا شعلہ ہے

اور افراد چنگاریاں ہیں
جن کے سینوں میں کتنے ہی بے باک و بے تاب شعلے
پرورش پا رہے ہیں
اِس تڑپتے ہوئے شعلے سے
جتنی چنگاریاں ٹوٹتی ہیں
اتنی ہی اور چنگاریاں چھوٹتی ہیں
اس طرح زندگی
گلُ بہ آغوشِ چنگاریوں سے
ہر گھڑی
اک نیا اور دہکتا ہوا ہار اپنے لئے گوندھتی ہے

کچھ تو چنگاریاں ایسی ہیں جو بھڑکتی نہیں جو تڑپتی نہیں
صرف اُڑتی ہیں اور ناچ کر ایک لمحے میں کھو جاتی ہیں
موت کی سرد آغوش میں جا کے سو جاتی ہیں
لیکن ایسی بھی کتنی ہی چنگاریاں ہیں
جن کے سینوں میں شعلے بھڑکتے ہیں اور خار و خس پر
لپکتے ہیں اور بجھتے بجھتے بھی دنیا اور انسانیت کو
رنگ اور نور کے ایک طوفان میں غرق کر جاتے ہیں

گرمیِ بزم صرف ایک رقصِ شرر تک نہیں ہے

ہم نسیمِ سحر کی طرح آتے ہیں باغِ انسانیت میں
دو گھڑی سبزہ و گل سے اٹھکھیلیاں کرتے ہیں
شاخ پر جھولتے ہیں
کنج کے سائے میں کھیلتے ہیں
اور گلوں کو
رنگ و بو دے کے اس باغ سے رقص کرتے چلے جاتے ہیں

ابر کی طرح چھاتے ہیں دنیا کے سر پر
اور پھر سبز کھیتوں کو سیراب کر کے
وادی و دشت و کوہ و بیاباں کو شاداب کر کے کڑکتے،
گرجتے، برستے، گزر جاتے ہیں

ہم ہمیشہ سے لمحوں کے مانند آتے رہے ہیں
اور آتے رہیں گے
لمحے جو وقت کی وسعت بیکراں سے امنڈتے ہیں اور ڈوب
جاتے ہیں پھر وقت کی وسعتِ بیکراں میں
یوں تو سب لمحے ہیں ایک سے

ایک سی ان کی رفتار ہے
ایک سی ان کی جھنکار ہے
پھر بھی یکساں نہیں
جو بھی لمحہ ہے وہ اک نئی آرزو
اک نئی جستجو
اک نیا ساز ہے اک نیا سوز ہے
اک نئی جدت ہے اک نئی روشنی

ہم ہیں انسانیت کے زمانے کے موسم
جو بدلتے رہے ہیں
اور بدلتے رہیں گے
جو نئے پھول پھل ساتھ لاتے رہے ہیں
اور لاتے رہیں گے
جو نئے رنگ سے کیاریوں کو سجاتے رہے ہیں
اور سجاتے رہیں گے
جو نئی کونپلوں سے نئے پیرہن
شاخساروں کو ہر سال لاکر پہناتے رہیں گے

ہم زمانے کے دریا سے موجوں کی صورت اُبھرتے رہے ہیں

اور اُبھرتے رہیں گے
زندگانی کی کشتی کو ہم اپنے سیّال سینے پر لے کر
آگے بڑھتے رہے ہیں
اور بڑھتے رہیں گے
اس سفینے کے ملاح روزِ ازل سے بدلتے رہے ہیں
اور بدلتے رہیں گے
بادباں بن کے افراد اُٹھتے رہے ہیں
اور اُٹھتے رہیں گے
یہ حسیں ناؤ انسانیت کی اسی طرح چلتی رہی ہے
اور چلتی رہے گی

ہم ہیں معمار انسانیت کے
اپنے آبا و اجداد معمار تھے
ہم بھی معمار ہیں
آنے والے زمانے کی نسلیں بھی معمار ہوں گی
زندگی کا فلک بوس ایوان اسی طرح بنتا رہا ہے
اور بنتا رہے گا
ہم جہاں اپنی صنّاعیاں ختم کر کے چلے جائیں گے
کل وہیں سے نئے عہد کے حوصلہ مند صنّاع

اپنے فن اور صنعت کا آغاز آ کر کریں گے

ہم اگر کل نہ ہوں گے تو کیا وقت کی تیز رفتار رک جائے گی ؟
زندگی کی کمر بوجھ سے غم کے جھک جائے گی ؟
گردشِ ماہ و انجم میں کیا فرق آجائے گا ؟
کیا اندھیرا زمانے پہ چھا جائے گا ؟

کل کے دن ہم نہ ہوں گے مگر
زندگی مسکراتی رہے گی
اپنی شمعیں جلاتی رہے گی
آسمانوں کا فیروزی رنگ اتنا ہی دلکش رہے گا
اور اُفق کی جبیں روشنی سے چمکتی رہے گی
آج کی طرح کل بھی زمیں
اپنے محور پہ گھوما کرے گی
اور فضاؤں کی لا انتہا نیلی پہنائیوں میں
آج کی طرح سے کل بھی جھوما کرے گی
آرتی بزمِ انجم اُتارا کرے گی
آج کی طرح کل بھی زمیں
چشمۂ نور میں غسل کر کے

سُرخ سورج کے آئینے میں اپنی زلفیں سنوا کرے گی

ہاں مگر آج اور کل میں اک فرق ہو گا
زندگی کل کی بھرپور ہو گی
کامرانی کی مے پی کے مخمور ہو گی
کل یہ لوہے کی موٹی سلاخیں
جو مرے اور ترے درمیاں ہیں پگھل جائیں گی
ظلم اور جبر کی ساری زنجیریں گل جائیں گی
کل غلامی کی لعنت، غریبی کی ذلّت، مصیبت، مشقّت، صعوبت، عداوت، جہالت
وہم کی بادشاہت، بہیمانہ خصلت، درندوں کی سی ظالم عادت جبلّت
خار و خس کی طرح آدمیت کے طوفاں میں بہہ جائے گی
آدمیت کا طوفان روزِ ازل سے اُمنڈتا رہا ہے
اور ابد تک اُمنڈتا رہے گا۔
یہ طوفان ہے جس کے ریلے میں فطرت کی سفّاکیاں بہہ گئی ہیں
یہ وہ طوفان ہے جو ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں برس سے گرجتا رہا ہے

اور گر جتا رہے گا

ہم جو برطانوی سلطنت کی
کھوکھلی اور پرانی چٹانوں سے ٹکرا رہے ہیں
ہم بھی انسانیت کے اسی جاودانی سمندر کی اک موج ہیں
زندگی، ارتقا اور تاریخ کی فوج ہیں
ہم بڑھیں گے تو تاریخ آگے بڑھے گی
ظلم اور جبر کی قوتوں سے لڑے گی
آج جس سمت میں ہم مڑیں گے اسی سمت میں ساری دنیا
مڑے گی
زندگی سُرخ شہپر لگا کر اُڑے گی

ہم ہیں وہ موجِ طوفاں کہ جو بڑھ کے گھٹتی نہیں
لاکھ دُشمن ہوں لیکن ہماری سپہ پیچھے ہٹتی نہیں

جب سے انسان نے اپنے نقشِ قدم سے
پُشتِ گیتی پہ عظمت کی مہریں لگائی ہیں اُس وقت سے
ساری نطرت
آدمیت سے لڑنے پر آمادہ ہے

اس کا ہمدرد و غم خوار کوئی نہ تھا
اس کا دلدار کوئی نہ تھا
ہر طرف صرف دشمن ہی دشمن نظر آرہے تھے
وادیاں، دشت، میداں، پہاڑ
اپنے دامن سمیٹے ہوئے تھے
دیو کی طرح سے سانس لیتے سمندر
اپنے سیّال جسموں کو جھاگ اور طوفان کی چادروں میں
لپیٹے ہوئے تھے
اپنے تاریک سینوں میں جنگل
اپنے اسرار اور بھید سب کچھ چھپائے کھڑے تھے
اونچے اونچے درخت اپنے میٹھے پھلوں کو
آدمی کی پہنچ سے بہت دور سر پر اٹھائے ہوئے تھے
کوہساروں کی نیلی چٹانیں
اور زمیں کی سنہری تہیں
اپنی گہرائیوں میں ہزاروں خزانے دبائے ہوئے تھیں
ندیاں غیظ میں پیچ و خم کھا رہی تھیں
سانپ کی طرح لہرا رہی تھیں
بجلیاں کالی کالی گھٹاؤں میں اپنی
آتش افشاں زبانوں سے پھنکارتی تھیں

زلزلے آتے تھے

برف اور آگ کے سخت طوفان چھاتے تھے اور چاند
سورج ستارے

ان میں کھو جاتے تھے

لیکن ان سیکڑوں دشمنوں کی

دشمنی کے اندھیرے میں انساں

اپنے ہاتھوں میں محنت، عمل اور تجسّس کی قندیل لے کر

درد، دکھ، شوق، ارماں، مسرّت، اُمنگ، آرزو، اور اُمید
کا بوجھ سر پر اُٹھائے ہوئے

آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا

اور ہر ہر قدم پر

کامرانی کے اور کامیابی کے پرچم

نصب فرما رہا تھا

آخرش وادیاں، دشت، میداں، پہاڑ اس کے قدموں
کے نیچے

فرش کی طرح سے بچھ گئے

ندیاں اُس کے فاتح قدم چومنے کے لیے رُک گئیں

اونچے اونچے درختوں کی اونچی ثمردار شاخیں

اس کی تسلیم کو جھک گئیں
برف کی چوٹیاں اس کی تعظیم کو جھک گئیں

کوہساروں کی دولت
آبشاروں کی طاقت
اور زمیں کے خزانے
اس کی خدمت میں حاضر ہوئے
اور انساں ہواؤں پہ اُڑنے لگا
موج طوفاں پہ چلنے لگا
بجلیاں اُس کی آغوش میں آگئیں اور دنیا
ذہن انساں کے انوار سے جگمگانے لگی
ساز لے کر تمدن اُٹھا اور تہذیب گانے لگی

سوچ ان مرحلوں کو
سوچ ان راستوں اور ان منزلوں کو
جن سے انسان اب تک گزرتا رہا ہے
اس کی راہوں میں دونوں طرف ڈھیر تھے ہڈیوں کے
اور ہر ہر قدم پر
خوں میں لتھڑے بریدہ سروں کے فلک بوس ٹیلے کھڑے
تھے

جن کی چوٹی پہ راتوں کو بھوت اور جنّات
اپنی محفل سجاتے تھے اور آتشیں حلقوں میں ناچتے تھے
اور تاریخ کے سبزہ زاروں میں بہتے ہوئے خون کی تیز بو سے
ہواؤں کا دم گھٹ رہا تھا

یہ پُرانے زمانے کے ان حکمرانوں کے نقشِ قدم تھے
جن کی سفّاکیوں کے فسانے
آج بھی دل کو دہلا رہے ہیں
لیکن انسان ان مرحلوں سے گزر کر
آج ان منزلوں پر کھڑا ہے جہاں ہر خزاں کے عقب سے
بہاریں گل افشانیاں کر رہی ہیں
اور غم کے اندھیرے افق سے مسرّت کی چھنتی ہوئی تیز کرنیں
رنگ اور نور سے دشت و کہسار کی گودیاں بھر رہی ہیں

اپنے اُجڑے ہوئے ملک کی کھیتیاں لہلہائیں گی شاداب ہو کر
دھان کی بالیاں مُسکرائیں گی گیہوں کے خوشوں میں تارے پھلیں گے

اور دھرتی کے سینے سے پھولوں کے فوّارے اُبلیں گے

مریم

جن میں نہائیں گے ہم

جاوید

آسمانوں سے اُتریں گی رنگیں بہاروں کی پریاں
دُور ہو جائیں گی قحط کی کالی پُرہول پرچھائیاں
ہر طرف نور ہی نور ہو گا
نور ہی نور ہو گا

مریم

میرے جاوید کی تیز آنکھوں کا نور، اس کے سینے سے بہتے ہوئے خون کا رنگ

جاوید

کارخانوں سے نغموں کے طوفاں اُٹھیں گے
اور غریبوں کے سُوکھے ہوئے زرد چہروں پہ رنگ آئے گا
زندگی اور آسودگی کا
ان کی مغموم آنکھیں خوشی کی نئی روشنی سے چمکنے لگیں گی

مریم

ہجر کی لمبی راتوں کے آنسو محبت کے ہلکے تبسم میں شہد و شکر بن کے گھل جائیں گے

جاوید

گردآلو آئینے دھل جائیں گے
اور ماؤں کی گودوں سے ہنستے ہوئے ننھے فرشتے اُتر کر زمین پر چلیں گے
جس طرح باغ میں پھول، آکاش پر چاند تاروں کے جھرمٹ
سبز مخمل کی وادی میں شبنم کے شفاف قطرے
اور چالیس کروڑ آدمی، وہ جو ہلکی سی اک مسکراہٹ سے محروم تھے
اس طرح کھلکھلا کر ہنسیں گے کہ جس طرح جوالا مکھی پھوٹتا ہے
اور یہ قہقہہ، ایک آزاد، بیباک، اُبھرتی ہوئی قوم کا قہقہہ
آسمان و زمیں پر
نور بن کر بکھر جائے گا

مریم

سارا عالم سنور جائے گا

جاوید

سچ بتا اب بھی غمگین ہے تو

مریم

ہاں میں غمگین ہوں، اب بھی غمگین ہوں، اب بھی غمگین ہوں
آہ یہ غم ہمیشہ مرے دل میں پلتا رہے گا

میری روتی ہوئی آنکھوں سے اشک بن بن کے ڈھلتا
رہے گا
کون ہے وہ جو تپھر کے سینے سے وزن اور دہکتے ہوئے سرخ
انگاروں کے دل سے ان کی تپش چھین لے گا؟
کون ہے وہ جو دل کی ہری شاخ سے غم کے چبھتے ہوئے
کانٹوں کو بین لے گا؟
یہ جدائی نہیں دل کا وہ درد ہے جس کی ٹیسیں
عمر بھر میرے پہلو میں اُٹھتی رہیں گی
آہیں سینے میں گھٹتی رہیں گی

جاوید

لیکن انسان کی رُوح سے غم کے دھبّے
وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ دُھل جاتے ہیں
کشتیٔ زندگانی کے لپٹے ہوئے بادباں
آنے والی مسرت کی ٹھنڈی ہواؤں سے کھل جاتے ہیں

مریم

پھر بھی بچھڑے ہوئے دوست احباب ملتے نہیں
ہاں تسلی سے تھوڑی سی تسکین ہوتی ہے لیکن
قلب اور رُوح کے زخم سلتے نہیں
رات کی تیرگی میں

پھول شبنم کے بوسوں سے مدہوش ہوتے ہیں۔ کھلتے
نہیں ہیں
چاند کی کرنیں جب اپنی نرم اور نازک
نسیم گوں انگلیوں سے
رات کے اُلجھے اُلجھے ہوئے ریشمی بال سلجھانے لگتی ہیں تو
اس کی نیلی رگوں میں
چاندنی خون کی طرح سے دوڑ جاتی ہے لیکن
پھر بھی اس کی جبیں سے اندھیرے کی پرچھائیں ہٹتی نہیں
ہے
ہاں تسلی سے تھوڑی سی تسکین ہو جاتی ہے
لیکن اس کے سہارے
عمر کٹتی نہیں ہے

جاوید

یہ زبانی تسلّی نہیں
بلکہ ایسی حقیقت ہے جو تیری آغوش میں پرورش پا رہی ہے
جو تری روح اور دل کو گرما رہی ہے
ہاں یہ سچ ہے کہ میں آج پھانسی کے پھندے کے نیچے
کھڑا ہوں
ایک برگِ خزاں ہوں

تجھ کو جتنا بھی غم ہو وہ کم ہے
تو مگر ایک کھلتا ہوا پھول ہے
ایک پھلتی ہوئی شاخ ہے
جس کے ایک اک رگ و ریشے سے کونپلیں پھوٹتی ہیں
تو مسرت کا پیغام ہے
ملک اور قوم کی آرزو کا چھلکتا ہوا جام ہے
اپنے سینے میں تو عہدِ نو کی بشارت چھپائے ہوئے ہے
زندگانی کا بارِ امانت اُٹھائے ہوئے ہے

... ...

(خاموشی)

(صرف ساز بجنے کی آواز)

رات کو میں نے اک خواب دیکھا
گود میں تیری مہتاب دیکھا
رات تاریک تھی اور سلاخوں سے باہر
آسماں ابر آلود تھا
ہر طرف موت کی سی خموشی
گویا پتھر کی اک سِل تھی جو جیل کی رات کے دل پر رکھی ہوئی تھی
میری تنہائی میں میری ہمدم بس اک ٹمٹماتی ہوئی شمع تھی

جس نے چھت اور دیوار پر
ہلکے ہلکے سے اک نور کا جال پھیلا دیا تھا
جیسے مایوسیوں کے اندھیرے میں امید کی جھلملاتی ہوئی روشنی
ہو

میں تھا، یہ کوٹھری اور سلاخیں
جن کی پرچھائیاں صحن کی خاک پر لیٹ کر سو گئی تھیں
اتنے میں نیند آئی
اپنی آنکھوں میں صدیوں کا کاجل لگائے ہوئے
اپنے آنچل میں سکھ کے ستارے چھپائے ہوئے
جیل کے پاسبانوں سے بچتی ہوئی
ہر قدم پر دلھن کی طرح سے ٹھٹکتی، جھجکتی ہوئی
آہٹیں صحن کے دیوار کی آڑ لے کر دبکتی ہوئی
چپکے سے کوٹھری میں چلی آئی اور میرے سینے پہ سر رکھ دیا
اپنی کالی گھنی زلف کو میرے شانوں پہ پھیلا دیا
آسماں کی بلندی سے نیلی گھٹائیں اترنے لگیں
اور پرچھائیاں سے بکھرنے لگیں
ہر طرف تیرگی چھا گئی
سنتری، پاسباں، بھوری دیواریں، چھت اور سلاخیں
شمع اور شمع کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی

ایک پُر کیف و مخمور اندھیرے میں گم ہو گئیں
نیند کی مدھ بھری گود میں سو گئیں

نیند ہے اک حسینہ
سرمئی آنکھیں ہیں نیلگوں اس کا سینہ
اس کی پلکوں کے سائے میں خوابوں کی مدہوش پرچھائیاں
کھیلتی ہیں
وہ غریبوں کی غم خوار دکھیوں کی دل دار ہے
اور فرق مراتب سے بیزار ہے
رات کو آتی ہے
تھپکیاں دے کے سارے جہاں کو سُلا جاتی ہے
بچّوں کو لوریاں دیتی ہے، پھولوں کو پیار کرتی ہے اور سارے
عالم پہ جادو بھری انگلیوں سے چھڑکتی
ہے شبنم
اس طرح بزم فطرت کی ہر چیز کو
اک نئی زندگی بخشتی ہے
اک نئی تازگی بخشتی ہے

رات وہ مجھ کو اپنے سُبک بازوؤں میں اُٹھا کر

جیل سے لے گئی
دور ـــــ احساس و ادراک کی سرحدوں سے بھی دور
ایک افسانوی سرزمیں تھی
ماضی و حال کی سوتی اور جاگتی وادیوں میں
خواب آلود ہلکے دھندلکے کے ایواں
چاندنی کے ستوں اور شفق رنگ محرابیں، پیشانیاں
جن کی عقدِ ثریّا سے آراستہ تھیں
واں نہ یہ جیل تھی اور نہ اس جیل کے پاسباں تھے
اور نہ یہ سخت اور سرد دیواریں تھیں
اور نہ پُر ہول تنہائی تھی
خواب کی خلوتیں انجمن بن گئی تھیں
کتنے بھُولے ہوئے چہرے، بسری ہوئی آنکھیں گذرے
ہوئے ماہ اور سال کے مسکراتے اُفق سے اُبھر
آئی تھیں
کتنی آوازیں خاموشی کے ساز سے پھُوٹتی تھیں
اک عجب رقص تھا اک عجب زمزمہ تھا
ساغروں کی کھنک، بانسری کی پگھلتی ہوئی لے، ہواؤں کی
سرگوشیاں
دوب کے فرش پر شبنم آلود ملبوس کی سرسراہٹ

چاند تاروں کے گیت اور ستاروں کی گنگناہٹ
وقت کے پاؤں کی نرم آہٹ
قہقہوں کی صدا اور کلیوں کے کھلنے کی آواز
سب کی سب ایک پُر کیف نغمے میں حل ہو گئی تھیں

ناگہاں جنگ کے طبل بجنے لگے
اور کروڑوں قدم ایک آہنگ کے ساتھ اُٹھنے لگے
آسماں ہل گیا اور زمیں تھرتھرائی
زندگی تلملائی
اور کوہِ ہمالہ
اپنے ہاتھوں میں ہندوستاں کے علم کو اُٹھائے ہوئے بڑھ
رہا تھا
اور اس کی جلو میں
ساری انسانیت
ایک غضب ناک سیلاب کی طرح اُمڈی چلی آ رہی تھی
سارے ہندوستاں کے بہادر مجاہد
اپنے سر کو ہتھیلی پہ رکھے ہوئے
اپنے دشمن سے ٹکرا رہے تھے
سرخ اور سبز پرچم

ترنگے کے پہلو میں لہرا رہے تھے
گولیاں چل رہی تھیں
لاکھوں سینوں سے جلتے ہوئے خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں
پھر بھی کوہ ہمالہ
اپنے ہاتھوں میں ہندوستاں کے علم کو اُٹھائے ہوئے
بڑھ رہا تھا
دشمنوں کی صفوں پر
چڑھ رہا تھا
غم کی ماری ہوئی ماؤں کی ہچکیاں
بھوک سے بلبلاتے ہوئے بچوں کی سسکیاں
نعروں، جیکاروں، للکاروں میں ڈھل گئی تھیں
ہر طرف سے صدا آ رہی تھی
"عہدِ نو تو کہاں ہے"
اور پھر شور اٹھا
"عہدِ نو آ گیا ہے"
میں جو پلٹا تو اک اور تصویر دیکھی
تیری گودی میں اک چاند تھا جس کے لب ہل رہے تھے

"عہدِ نو آ گیا ہے

میں ہوں گوتم کے سینے کی آواز
میں ہوں تخئیل انساں کی پرواز
میں ہوں ٹیپو کی تلوار
میں ہوں جھانسی کی رانی کے خوابوں کی تعبیر
میں شہیدوں کے ماتھے کی تنویر
میں بھگت سنگھ کی رُوح ہوں
میں نئے عہد کے سخت طوفان میں
کشتیٔ نوح ہوں
میں ہوں چٹگاؤں کے باغیوں کا ترانہ
میں محمد علی کا فسانہ
میں ہوں اقبالؔ و ٹیگورؔ کا زمزمہ
میں ہوں دہقان و مزدور کا ہمہمہ
میرے خوں میں ہے گنگ و جمن کی روانی
اور رگوں میں ہمالہ کی کڑیل جوانی
عہدِ نو آگیا ہے
عہدِ نو آگیا ہے
دور ہو اے شہنشاہیت کے جذام
جاگ ہندوستاں کے غلام
انتقام، انتقام، انتقام، انتقام"

یہ صدا سُن کے افلاک پر بجلیاں کڑکڑانے لگیں
اور میں چونک اٹھا
رات تاریک تھی اور سلاخوں سے باہر
آسماں ابر آلود تھا
جیل کی اونچی دیواروں پر بجلیاں آتشیں راہواروں کو دوڑا رہی تھیں
اپنے کوڑوں کو کڑکا رہی تھیں
ابر آلود اندھیرے کے دل میں سنہرے عقابوں کے شہپر چمک اُٹھے تھے
بجلیوں کی کڑک اور چمک، بادلوں کی گرج
انقلاب اور بغاوت کی الھڑ حسینہ کی پازیب کی تیز جھنکار تھی
یہ اندھیرے اُجالے کی پیکار تھی
جس کے ادنیٰ سپاہی ہیں ہم

فرنگی

وقت باقی رہا ہے زیادہ نہ کم
اب جدا تم کو ہونا ہے باچشمِ نم

جاوید

دیکھ افق پر اندھیرا مچلنے لگا

دن شفق کی سنہری پہاڑی سے ڈھلنے لگا
اب تلک شام کا جمپئی رنگ آنچل فضاؤں میں لہرا رہا تھا
آسماں پھول برسا رہا تھا
لیکن اب یک بیک سرخ پھولوں کی ہر پنکھڑی سرمئی
ہو چلی ہے
روشنی تیرگی کے سیہ غار میں کھو چلی ہے
اور فرنگی کے چہرے پہ تاریکیاں اک بھیانک ہنسی ہنس
رہی ہیں
نظریں غیظ اور نفرت کے شعلوں سے دہکی ہوئی ہیں
اور رعونت سے اینٹھے ہوئے ہونٹ یہ کہہ رہے ہیں
"وقت باقی رہا ہے زیادہ نہ کم"
اب جدا ہم کو ہونا ہے باچشم نم
میری مریم
میری مریم

مریم (گھبرا کر)

ہر طرف ہے یہ کیسا اندھیرا؟

جاوید

اس کے پیچھے چھپا ہے سویرا
جا کے کہنا ہے یہ اہل وطن سے

روح خوش ہو کے نکلی ہے تن سے
ہاتھ میں جام ہندوستاں کا
لب پہ ہے نام ہندوستاں کا

مریم

جو ہے مرنے پہ باندھے کمر ہے
ملک سارا ترا ہم سفر ہے

جاوید

اور کچھ اور نزدیک آجا
اک خلش سی ہے دل میں مٹا جا
دیکھ لوں آخری بار تجھ کو
کر لوں اک رخصتی پیار تجھ کو

(مریم کے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہے)

مریم

رخصت اے میرے جاوید رخصت
ڈوبنے والے خورشید رخصت

(جاتی ہے)

جاوید

رخصت اے مریم، اے "جان مریم"
رخصت اے آدم، اے نسلِ آدم

(اس کی آواز مریم کے قدموں کی
آواز کا تعاقب کرتی ہے)

رخصت اے زندگی کی بہارو
رخصت اے جاودانی شرارو
رخصت اے آسمانی نظارو
رخصت اے چاند، سورج، ستارو
رخصت اے نیلگوں کوہسارو
رخصت اے نقرئی آبشارو
رخصت اے گنگناتی ہواؤ
رخصت اے مسکراتی فضاؤ
رخصت اے صبح اے شام رخصت
رخصت اے حسنِ گل فام رخصت
رخصت اے انقلابی جوانو
رخصت اے ہند کے باغبانو
جب نئے خاکے میں رنگ بھرنا
ہم شہیدوں کو بھی یاد کرنا

چھٹی تصویر

گُل اس شاخ سے ٹوُٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھُوٹتے بھی رہے

اقبالؔ

چھٹی تصویر

مریم کا نوحہ

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

تیری محبوب مریم بلاتی ہے تجھ کو
کیا کبھی اس کی بھی یاد آتی ہے تجھ کو
اب تو آنکھیں ترستی ہیں صورت کو تیری
ہو گئیں میری تو تیسوں راتیں اندھیری
زہر لگتی ہے اُجڑی ہوئی زندگانی
آہ رکتی نہیں آنسوؤں کی روانی

غم کی سِل ہوتی جاتی ہے کچھ اور بھاری
بڑھتی جاتی ہے کچھ اور بھی بے قراری
رُوٹھ کر جانے والے مناتی ہوں تجھ کو
تیری مریم ہوں میں، میں بلاتی ہوں تجھ کو
ملک تیرا ہے مصروفِ پیکار اب بھی
خاک ہے سُرخ بوندوں سے گلنار اب بھی
خوں بھرے پرچم انگڑائی لیتے ہیں آ جا
جنگ کے طبل آواز دیتے ہیں آ جا
کب تلک، کب تلک کوئی آخر پکارے
آ بھی جا، آ بھی جا، آ بھی جا میرے پیارے

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

میری آنکھوں میں پہلی سی اب بھی چمک ہے
میرے ہونٹوں کے پھولوں میں اب بھی مہک ہے
میں تری آرزوؤں کا گلشن ہوں اب بھی
تیرے رنگین خوابوں کا مسکن ہوں اب بھی
میرے سینے میں ہے زندگی کا شرارہ

میرے پہلو میں ہے حُرّیت کا ستارہ
باندھ کر اپنے ماتھے پہ سونے کا سہرا
یاد ہے تونے اُلٹا تھا گھونگھٹ کسی کا
بیاہ کی میرے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی
صندلی مانگ تھی اُس میں افشاں چُنی تھی
اور اب مہندی ہاتھوں میں رچتی نہیں ہے
کوئی چوڑی کلائی میں بجتی نہیں ہے
ہائے کس نے وہ مہندی کی رنگت اُڑا لی
کس نے یہ میرے ماتھے سے افشاں چھڑا لی

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبّت کی منزل کے راہی

یاد ہوگا تجھے وہ مرا لال جوڑا
تونے کیسا اپنا وہ عہد و پیماں بھی توڑا؟
میرے سنسان دل میں ہے کیسا اندھیرا
کیا کبھی میری دُنیا میں ہوگا سویرا؟
تو نہیں ہے تو بھاتا نہیں کچھ بھی مجھ کو
کیا کہوں کس طرح یاد کرتی ہوں تجھ کو

ہار اشکوں کے بیٹھی ہوئی گوندھتی ہوں
میں تجھے رات بھر تاروں میں ڈھونڈتی ہوں
ہوک اُٹھتی ہے چڑیوں کی آواز سُن کر
پھینک دیتی ہوں رنگیں دوپٹے کو چُن کر

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

ہنستی اور کھیلتی چاندنی رات آئی
گرمیوں بعد بھرپور برسات آئی
چھائیں ساون کی وہ کالی کالی گھٹائیں
اور پھر چیت پھاگن کی سنکیں ہوائیں
آم کے سبز باغوں میں پھر بور آیا
کوئلوں نے محبت بھرا گیت گایا
سب ہی آئے مگر ایک تو ہی نہ آیا
اپنے گھر اپنی مریم کو تو نے بھلایا
یوں تو دُنیا کی ہر چیز ہے آنی جانی
ہو گئیں کل کی باتیں پُرانی کہانی
اس طرح اپنی نظریں پھراتا ہے کوئی

کیا محبت کو بھی بھول جاتا ہے کوئی
شام ہوتی ہے اور ڈوب جاتا ہے سورج
صبح ہوتے ہی پھر لوٹ آتا ہے سورج
میرا سورج مگر جا کے واپس نہ آیا
جانے کیوں میرے پیارے کو پردیس بھایا

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبّت کی منزل کے راہی

ندیاں دوڑ کر ملتی ہیں ساگروں میں
بھر کے رس لڑکیاں لاتی ہیں گاگروں میں
رات کی گود میں سوتے ہیں چاند تارے
چومتے ہیں زمیں کو فلک کے کنارے
باغ میں دور سے اُڑ کے آتے ہیں بھونرے
پھول کو گیت اپنا سناتے ہیں بھونرے
ساری دنیا پہ چھائی ہوئی ہے محبّت
بے محبّت کے ممکن نہیں ہے مسرّت

(ایک عورت کے ہنسنے کی آواز)
ہنس رہی ہے کہیں کوئی میری سہیلی

اور میں گھر میں بیٹھی ہوئی ہوں اکیلی
دیکھتی ہوں میں جب اپنی ہم جولیوں کو
پیت کے پھولوں سے بھرتی ہیں جھولیوں کو
ان کی آنکھوں کے تارے چمکتے ہیں کیسے
ان کے دوشیزہ آنچل مہکتے ہیں کیسے
مسکراتے ہیں رہ رہ کے اُن کے گریباں
ان کی سانسوں میں کھلتی ہیں رنگین کلیاں
جگمگاتا ہے چاند ان کی پیشانیوں پر
ان کے سینے ہنسی اور خوشی کے سمندر
میرے دل سے نکلتی ہیں کتنی دُعائیں
ان کو اپنی بہاروں کے دن راس آئیں
ناچتی آرزو پر نہ پھر جائے پانی
ہو نہ غمگین و افسردہ اُن کی جوانی
اور بھی ان کی شاداب کھیتی ہری ہو
مانگ صندل سے، بچوں سے گودی بھری ہو

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

وہ مسرت کے بیتے دلوں کی کہانی
میرے حسن و محبت تری نوجوانی
ان کو میں واپس آتے ہوئے دیکھتی ہوں
زیرلب مسکراتے ہوئے دیکھتی ہوں
رنگ ہی رنگ بس تیرتے ہیں فضا میں
سیکڑوں تتلیاں اُڑ رہی ہیں ہوا میں
گذری راتوں کے طوفان دل میں چھپائے
لمحے اُڑتے ہیں ہاتھوں پہ شمعیں جلائے
دن بنے ہفتے، ہفتے بنے ہیں مہینے
وقت کے چلتے رہتے ہیں یوں ہی سفینے
اک نیا رنگ بھر لیتی ہے زندگانی
بن کے ماں مسکراتی ہے الھڑ جوانی
خواب میں مجھ کو آواز دیتا ہے کوئی
کروٹیں میرے پہلو میں لیتا ہے کوئی
جیسے بجلی سی لہراتی ہو بادلوں میں
جیسے جھنکار ہو نقرئی چھاگلوں میں
یوں مچلتا ہے وہ جیسے سوتوں میں پانی
جیسے بے تاب رگ رگ میں ہو نوجوانی
سنسنی جسم میں، چیونٹیاں جیسے رینگیں

درد پیڑو میں رہ رہ کے لیتا ہے ہلکیں
زندگی کا نیا پھول ہے کھلنے والا
ہے مرے صبر کا پھل مجھے ملنے والا
سوچتی ہوں کہ وہ تیری تصویر ہو گا
میرے بچپن کے خوابوں کی تعبیر ہو گا
اس کے چہرے پہ ہو گا محبت کا ہالہ
اس کے ماتھے پہ تیری جبیں کا اُجالا
کھائے جاتی ہے اس وقت تو تیری دوری
ہائے رہ جائے گی یہ خوشی بھی ادھوری
کھول کر اپنی آنکھیں وہ دیکھے گا کس کو
ہائے وہ باپ کہہ کر پکارے گا کس کو
یہ نہیں کہتی ہوں مجھ سے ملنے کو آنا
اپنے بچے کو بس اک نظر دیکھ جانا
وہ مری آنکھ کا تارہ وہ میرا دلبر
باپ کے پیار کو رہ نہ جائے ترس کر

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

کب تلک، کب تلک کوئی آخر پکارے
آ بھی جا، آ بھی جا، آ بھی جا میرے پیارے
آ بھی جا میرے پیارے
میرے دل کے سہارے

(نامہ بر آتا ہے)

کیا یہ جاوید و مریم کا گھر ہے؟

مریم

ہاں مگر یہ بتا کیا خبر ہے؟
تجھ کو اپنا کہوں یا پرایا؟
نامہ بر کس کا خط لے کے آیا؟
موت کا جام یا زندگی کا؟
غم کا پیغام ہے یا خوشی کا؟

نامہ بر

زندگی ہے غموں کی کہانی
موت کا راگ ہے جاودانی
موت کی چھاؤں دیوار و در پر
موت کے پاؤں ہیں بحر و بر پر

موت کا رنگ ہے آب و گل میں
موت سوتی ہے پھولوں کے دل میں
موت سے کس کو ہے رستگاری
آج وہ کل ہماری ہے باری
لیکن ایسے بھی ہیں مرنے والے
اپنی ماؤں کی گودوں کے پالے
جو اندھیرے سے ڈرتے نہیں ہیں
چڑھ کے سولی پہ مرتے نہیں ہیں
وہ ہیں ہمت کے جرأت کے پیکر
چلتے ہیں موت کا سر کچل کر
موت کا دل دہلتا ہے ان سے
موت کا دم نکلتا ہے ان سے
زندگی قوم پر وارتے ہیں
موت پر قہقہے مارتے ہیں
تازہ ہے ان شہیدوں کا گلشن
نام ان کا ہمیشہ ہے روشن

مریم

تو تو آیا ہے لے کر نشانی
لٹ گئی ہائے میری جوانی

نامہ بر

تیرا شوہر جہاں سے سدھارا
اب ہے وہ آسماں کا ستارا
خوش ہو وہ فخرِ ہندوستاں ہے
آج سے زندۂ جاوداں ہے

مریم

کیا کہا؟ زندۂ جاوداں ہے؟
سچ بتا میرا شوہر کہاں ہے؟
اُس نے جامِ محبت پیا تھا
لوٹ آنے کا وعدہ کیا تھا
تیرے ہاتھ اس نے پیغام بھیجا؟
کیا کوئی خط مرے نام بھیجا؟

نامہ بر

(خط دکھا کر)

آخری اس کا پیغام ہے یہ
پر کسی اور کے نام ہے یہ

مریم

اس کا کیا کوئی میرے سوا ہے؟
مجھ کو کیا جانے کیا ہو رہا ہے
میں نے دی اس کو اپنی جوانی

آرزو، دل کشی، شادمانی
اپنے ہونٹوں کی شادابیاں دیں
اپنے سینے کی بےتابیاں دیں
رُوح کو اُس کی میں نے جگایا
اس کے سنسان دل کو لبھایا
میں نے مہکا دیا اس کا گلشن
حسن سے بھر دیا اس کا دامن
عشق کی پیاس میں نے بجھائی
شمع تاریک گھر میں جلائی
اس کے جذبات کی ترجماں ہوں
اس کے ننّھے سے بچّے کی ماں ہوں

نامہ بر

اس کی اُلفت کا پیغام ہے یہ
تیرے بچّے ہی کے نام ہے یہ

مریم

میرا بچّہ؟ مگر وہ کہاں ہے؟
میرے پہلو میں اب تک نہاں ہے
کیسے وہ تیری باتیں سُنے گا؟
کیسے جاوید کا خط پڑھے گا؟

نامہ بر

وہ جو پہلو میں اب تک نہاں ہے
عہدِ نو کا مبارک نشاں ہے
جوش و ہمّت کا پیغام یہ خط
ہے نئی نسل کے نام یہ خط
وہ نئی نسل جو آ رہی ہے
وقت کا خون گرما رہی ہے
تیرے شوہر نے مرنے سے پہلے
خط لکھا تھا یہ اپنے لہو سے
وہ اندھیرے سے ڈرتا نہیں ہے
چڑھ کے سولی پہ مرتا نہیں ہے

مریم

خوش ہوں وہ فخرِ ہندوستاں ہے
آج سے زندۂ جاوداں ہے
زندۂ جاوداں ہے
زندگی جاوداں ہے
آرزو جاوداں ہے
حسن بھی جاوداں عشق بھی جاوداں ہے
میرا بچہ

میرا بچہ
وہ بھی تو زندۂ جاوداں ہے
میرا شوہر
میرا جاوید
فخرِ ہندوستاں ہے
آسمان و زمیں کو سُنا دو
ساری دنیا کو جا کر بتا دو
اس نے مجھ کو بھُلایا نہیں ہے
نقشِ الفت مٹایا نہیں ہے
عہدِ نَو کو بُلانے گیا ہے
چاند سورج کو لانے گیا ہے
آئے گا اور ضرور آئے گا وہ
صبحِ نَو بن کے چھا جائے گا وہ
جب گریں گے غلامی کے ڈیرے
جب اُڑیں گے خوشی کے پھریرے
راگنی قہقہوں کی چھڑے گی
ایک آزاد دُنیا بنے گی
مسکراتا ہوا آئے گا وہ
جگمگاتا ہوا آئے گا وہ

اس نے آنے کا وعدہ کیا ہے
میرا جام محبت پیا ہے
آئے گا اور ضرور آئے گا وہ
صبح نو بن کے چھا جائے گا وہ

(مبہوت کھڑی رہتی ہے)

نامہ بر نامہ بر ——— میرا شوہر
کیا کہا اُس نے پھانسی پہ چڑھ کر؟
کیا مجھے یاد اس نے کیا تھا؟
کیا مرا نام اس نے لیا تھا؟

نامہ بر

ہاں لیا اور لیا نام تیرا
مرتے مرتے پیا جام تیرا
چوم کر اس نے پھانسی کی رسی
آنے والی سحر کی خبر دی
رنگ سا اُس کے چہرے پہ آیا
اور وہ زیر لب مسکرایا
اور پھر یوں گرج کر پکارا
موت سے کیا رُکے گا یہ دھارا
بن کے سورج اُٹھیں گے ستارے

پھول بن کر کھلیں گے شرارے
موت کے لاکھ طوفان آئیں
ظلم کے ابر کتنے ہی چھائیں
رات کتنی ہی تاریک ہوجائے
آسماں چاہے نظروں سے کھوجائے
پر اندھیرا اُجھل کر رہے گا
صبح سورج نکل کر رہے گا
پھول کو کون کھِلنے سے روکے؟
کون آتے زمانے کو ٹوکے؟
یہ حکومت یہ ظالم حکومت کے ظالم شکنجے
کیا یہ ہندوستاں کے غلاموں کے لاکھوں کروڑوں گلے
گھونٹ دیں گے؟
کیا یہ جیلیں، یہ جیلوں کے پاپی ستمگار بدکار جیلر
کیا یہ فوجیں، یہ توپیں، یہ بندوق، سنگین اور بم کے
گولے
کیا ہمالہ سے سیلون تک اور بنگال و آسام سے لے کے
کشمیر تک
سارے ہندوستاں کو تشدد کے جلتے ہوئے تند اور
تیز دوزخ کی بگھلی

ہوئی آگ میں جھونک دیں گے ؟
کیا یہ بڑھتی ہوئی نسلِ انساں کو بھی روک دیں گے ؟
ہاں کھوان سے سینے میں دل میں کچوکے لگائیں
اور زخموں سے انسان کے جسم اور روح میں لاکھ سوراخ
کردیں
لیکن اب وہ گھڑی آ گئی ہے کہ ہر زخم سے ہوں گی پیدا
ہزاروں زبانیں جو دریا کو وادی کو کہسار کو، دشت
کو ڈر کو، میدان کو، ایک اک اینٹ ایک
ایک پتھر کو، ایک ایک ذرّے کو پیغام دیں
گی ــــ بغاوت
اور ان پھانسیوں اور جیلوں کے پیچھے دہکتے اُفق پر مچلتے
ہوئے سرخ خوں کے سمندر سے موجوں کے بیتاب
سینے کو یوں چیر کر آسماں پر اُبھر آئے گا سرخ آزاد
دنیا کا آزاد سورج
جس طرح ماں کی گودی میں بچّہ

مریم

جیسے جاوید و مریم کا بچّہ
موت کے لاکھ طوفان آئیں
ظلم کے ابر کتنے ہی چھائیں

رات کتنی ہی تاریک ہو جائے
آسماں چاہے نظروں سے کھو جائے
پر اندھیرا اُچھل کر رہے گا
میرا بچہ ـــــــ

کیا کہا میں نے ؟
میرا بچہ ؟
میرا شوہر ؟
میرا سورج نکل کر رہے گا
نامہ بر خط کو پڑھ کر سُنا دے
سو رہی ہے یہ دُنیا جگا دے
بیت جائیں پُرانے زمانے
عہدِ نَو کے بجیں شادیانے

نامہ بر (خط کو پڑھ کر سُناتا ہے)

محبت کے ننھے شرارے سلام
اندھیرے کے روشن ستارے سلام
ابھی ماں کے پہلو میں مستور ہے
ابھی زندگی سے بہت دور ہے
اندھیرے میں گم ہیں ترے فکر و ہوش
ابھی ہیں عدم میں ترے چشم و گوش

تری آنکھ محرومِ نظّارہ ہے
ابھی بطنِ مادر ہی گہوارہ ہے
ابھی تک ہے ہستی تری بے نمود
فقط گردشِ خوں ہے تیرا وجود

ابھی بن رہے ہیں وہ نقش و نگار
کہ جن کا زمانے کو ہے انتظار

مبارک تجھے گردشِ ماہ و سال
ابھرنے ہی کو ہیں ترے خط و خال
کلی تیری ہستی کی کھِل جائے گی
مسرّت تری ماں کو مِل جائے گی
ترے نقش کو بخش دے گی ثبات
پلائے گی وہ تجھ کو آبِ حیات
ترے دل میں ہوگی تمنّائے نور
تری سانس میں زندگی کا سرور
کریں گی ہوائیں تجھے آ کے پیار
تجھے لوریاں دیں گے لیل و نہار
تجھے دیکھ کر مسکرائے گا چاند

اشاروں سے تجھ کو بلائے گا چاند
ستاروں کو حیرت سے دیکھے گا تو
اُنھیں توڑ لینے کو لپکے گا تو

یہی سوچ کر مسکراتا ہوں میں
تجھے زندگی دے کے جاتا ہوں میں

ڈھلا دن مری عمر کا آئی شام
اجل لائی ہے زہر آلود جام
مجھے ڈر نہیں موت کی رات کا
جو غم ہے تو ہے صرف اس بات کا
وہ دُنیا وراثت میں پائے گا تو
جسے دیکھ کر تلملائے گا تو
یہ ہے تیرے ماضی کی کل کائنات
حوادث کے طوفاں مصائب کی رات
عداوت کے نغمے، کدورت کے ساز
لہو کے سمندر، ستم کے جہاز

مگر پھر بھی جنسِ گراں ہے حیات

رواں ہے دواں ہے جواں ہے حیات

نئی تیری صہبا، نئے ہیں سبو
مری شرم کے داغ دھوئے گا تو

بنانا چٹانوں کے سینے پہ راہ
مگر اپنے ماضی پہ رکھنا نگاہ
کہیں ہمتوں کا نفس رُک نہ جائے
ترے حوصلوں کی جبیں جھک نہ جائے

جوانی کہ جذبات کی آگ ہے
تمنّاؤں کا آتشیں راگ ہے
بھلانا نہ اس آتشیں راگ کو
بجھانا نہ جذبات کی آگ کو

خود اپنے لہو سے جلانا اسے
ہوا و ہوس سے بچانا اسے
جبیں تیری اس سے دمکتی رہے
نظر تیری اس سے چمکتی رہے

اسی آگ میں تپ کے نکھرے گا تو
اُفق سے زمانے کے اُبھرے گا تو

نہ کرنا کبھی چشمِ حیرت کو بند
نہ ٹوٹے کبھی جستجو کی کمند

بتاتا ہوں میں تجھ کو رازِ حیات
عمل ہے عمل کارسازِ حیات

عمل کے لئے ہے فضا سازگار
شکاری ہے انساں زمانہ شکار

جو طوفان آئیں تو ڈرنا نہیں
مصیبت میں بھی آہ بھرنا نہیں

کبھی جذبۂ شوق گھٹنے نہ پائے
نظر آسمانوں سے ہٹنے نہ پائے

گذرنا مصائب سے منہ موڑ کر
حوادث کی زنجیر کو توڑ کر

یہ مانا کہ تاریک ہوتی ہے رات
ستاروں کے موتی پروتی ہے رات

جہانِ کہن کا یہ دستور ہے
سیاہی کے آغوش میں نور ہے

اگر دل میں ہے آرزو کا سرور
تو ہے زندگی نغمۂ رنگ و نور

مسرّت نہاں سنگ پاروں میں ہے
فضاؤں میں ہے شاخساروں میں ہے
ہوائیں بجاتی ہیں جس دم ستار
پہاڑوں پہ گاتے ہیں جب آبشار
ہرے ہو کے جب لہلہاتے ہیں کھیت
بھری دُھوپ میں جب چمکتی ہے ریت
کرن پھُوٹتی ہے جب افلاک سے
نکلتی ہیں جب کونپلیں خاک سے
اُفق سے اُبلتا ہے جب رنگ و نور
ہواؤں میں اُڑتے ہیں جس دم طیور
تو بجتا ہے دل میں خوشی کا رباب
مسرّت پلاتی ہے آکر شراب

یہ دریا یہ وادی یہ صحرا یہ پھُول
مسرّت نے بھیجے ہیں اپنے رسول

کوئی شے نہیں ہے جہاں میں حقیر
لبوں کا تبسّم، نگاہوں کے تیر
یہ شبنم کے قطرے خس و خار پر

یہ ڈھلتی ہوئی دُھوپ دیوار پر
یہ شاخوں میں ہنستی ہوئی پتّیاں
یہ پانی کے چشمے یہ پگ ڈنڈیاں
یہ مکڑی کے جالے، یہ چاندی کے تار
یہ پیڑوں کی گردن میں پھولوں کا ہار
یہ آندھی سے طوفان سے کم نہیں
سمندر کے ہیجان سے کم نہیں
انھیں سب سے مل کر بنی ہے حیات
یہ سانچے ہیں جن میں ڈھلی ہے حیات

نہ ہو زندگی سے کبھی دل فگار
عمل سے بنا لے اسے سازگار

شکاری ہے انساں زمانہ شکار

حرفِ آخر

یہ آدمی کی گذرگاہ ——— شاہ راہِ حیات
ہزاروں سال کا بارِ گراں اُٹھائے ہوئے
جبیں یہ کاتبِ تقدیر کی جلی تحریر
گلے سے سیکڑوں نقش قدم لگائے ہوئے
گذرتے وقت کے گرد و غبار کے نیچے
حسین جسم کی تابندگی چھپائے ہوئے
گذشتہ دَور کی تہذیب کی منازل کو
جوان ماں کی طرح گود میں سلائے ہوئے

یہ آدمی کی گذرگاہ ——— شاہ راہِ حیات

ہزاروں سال کا بارِ گراں اُٹھائے ہوئے
اِدھر سے گذرے ہیں چنگیز و نادر و تیمور
لہو میں بھیگی ہوئی مشعلیں جلائے ہوئے
غلاموں اور کنیزوں کے کارواں آئے
خود اپنے خون میں ڈوبے ہوئے نہائے ہوئے
شکستہ دوش پہ دیوارِ چین کو لادے
سروں پہ مصر کے اہرام کو اُٹھائے ہوئے
جلالِ شیخ و شکوہِ برہمنی کے جلوس
ہوس کے سینوں میں آتشکدے چھپائے ہوئے
جہالتوں کی طویل اور عریض پرچھائیں
توہمات کی تاریکیاں جگائے ہوئے
سفید قوم کے عیار تاجروں کے گروہ
فریب و مکر سے اپنی دکاں سجائے ہوئے
شکست خوردہ سیاسی گداگروں کے ہجوم
ادب سے، ٹوٹی ہوئی گردنیں جھکائے ہوئے
غموں سے چُور مسافر، تھکے ہوئے راہی
چراغ رُوح کے، دل کے کنول بُجھائے ہوئے

یہ آدمی کی گذرگاہ ــــــ شاہراہِ حیات

ہزاروں سال کا بارِ گراں اُٹھائے ہوئے
نئے اُفق سے نئے قافلوں کی آمد ہے
چراغِ وقت کی رنگین لَو بڑھائے ہوئے
بغاوتوں کی سپہ انقلاب کے لشکر
زمیں پہ پاؤں فلک پر نظر جمائے ہوئے
غرورِ فتح کے پرچم ہوا میں لہراتے
ثبات و عزم کے اُونچے علم اٹھائے ہوئے
ہتھیلیوں پہ لئے آفتاب اور مہتاب
بغل میں کرۂ ارضِ حسیں دبائے ہوئے
اُٹھو اور اُٹھ کے انھیں قافلوں میں مل جاؤ
جو منزلوں کو ہیں گردِ سفر بنائے ہوئے
قدم بڑھائے ہوئے اے مجاہدانِ وطن
مجاہدانِ وطن ہاں قدم بڑھائے ہوئے

۲۸ دسمبر ۱۹۴۶ء

۲

جمہُور

ایک سیاسی مثنوی

طبع اوّل	مارچ ۱۹۴۶ء
طبع دوم	فروری ۱۹۴۷ء
طبع سوم	جون ۱۹۷۲ء

پیش لفظ

اُردو میں سیاسی مثنوی کا رواج نہیں ہے۔ "جمہور" اس قسم کی پہلی چیز ہے۔

پُرانی مثنویوں میں عام طور سے دیو پریوں کے قصے اور شہزادوں کے عشق کی داستانیں ہوتی تھیں۔ عام انسان تو کیا اس کی پرچھائیں بھی کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ مرزا شوق لکھنوی ان روایتی بلندیوں سے صرف اتنے نیچے اُتر سکے کہ پری کی جگہ سوداگر کی بیٹی اور شہزادے کی جگہ لکھنؤ کے نواب صاحب نے لے لی۔ اقبال نے پہلی بار مثنوی کو اعلیٰ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ لیکن انھوں نے انسپریشن ایرانی شعراء اور خصوصیت کے ساتھ مولانا روم کی مثنوی سے حاصل کیا تھا۔ حالانکہ اقبال کی مثنویوں میں بھی عام انسان کا کردار نہیں اُبھرتا۔ صرف "جاوید نامہ" کے آخری حصے میں عوام کا ذکر اس طرح آتا ہے کہ "دیدہ ام صدق وصفا اندر عوام" پھر بھی انھوں نے آنے والے شعراء کے لئے نئی راہ کھول دی۔

حیرت ہے کہ اس مفید صنف سے ترقی پسند شعراء نے اب تک کوئی کام نہیں لیا۔ جہاں تک مجھے علم ہے کیفی کے سوا کسی دوسرے شاعر نے مثنوی کی

طرف توجہ نہیں کی ہے۔ شائد انھوں نے مثنوی کو پرانی چیز سمجھ کر ترک کردیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس صنف میں بہت امکانات ہیں۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ ہم اس سے بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ جب میں ہندوستان اور دنیا کے موجودہ حالات، قومی اور بین الاقوامی جدوجہد اور کشمکش اور ان سے پیدا ہونے والے انسانی جذبات واحساسات کی وسعت اور پھیلاؤ کو دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ مثنوی کے سوا اور کوئی صنف شعر انھیں اپنے دامن میں نہیں سمیٹ سکتی۔ فردوسی کے "شاہنامہ" سے اقبال کے "ساقی نامہ" تک فارسی اور اردو مثنوی کا ورثہ ہمارا بہت بڑا سرمایہ، بہت بڑی دولت ہے۔ پھر یہ کفرانِ نعمت کیوں؟

ابھی تک عصر حاضر کا شاندار رزمیہ نہیں لکھا گیا ہے جس کا تاروپود وقت نے تیار کردیا ہے۔ "جمہور" ایک حقیر سی کوشش ہے۔ اس کے ہیرو عوام ہیں۔ محنت کش اور باعمل عوام جن کے ہاتھوں میں زندگی کی باگیں ہیں۔ وہ سطح زمین پر کیڑوں کی طرح نہیں رینگ رہے ہیں بلکہ کرۂ ارض کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں۔ اسی لئے رجعت پرستوں کا نعرہ یہ ہے کہ عوام آرٹ اور شعر کا موضوع نہیں ہو سکتے۔

عوام سب سے بڑی حقیقت ہیں۔ ان کے خواب سب سے سہانے خواب ہیں۔ ان کا نصب العین سب سے بلند نصب العین ہیں۔ وہ سماج اور تاریخ کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہے ہیں۔ زندگی انھیں سے حرارت حاصل کرتی ہے۔ اور انھیں سے رنگ شعروادب انھیں سے حُسن وقوت حاصل کرسکیں گے۔

اس درخت کی پتّیاں توڑی جا سکتی ہیں۔ شاخیں کاٹی جا سکتی ہیں لیکن اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ انھیں اس وقت تک نہیں اُکھاڑا جا سکتا جب تک کرۂ ارض کو پاش پاش نہ کر دیا جائے۔ اس لئے کٹی ہوئی شاخوں سے نئی کونپلیں پھوٹتی رہیں گی۔ نئی پتّیاں نکلتی رہیں گی، نئے پھول کھلتے رہیں گے۔

سردار جعفری
بمبئی۔ دسمبر ۱۹۴۶ء

حرفِ اوّل

اُٹھو ہند کے باغبانو اُٹھو
اُٹھو انقلابی جوانو اُٹھو

کسانو اُٹھو کامگارو* اُٹھو
نئی زندگی کے شرارو اُٹھو

اُٹھو کھیلتے اپنی زنجیر سے
اُٹھو خاکِ بنگال و کشمیر سے

اُٹھو وادیٔ و دشت و کہسار سے
اُٹھو سندھ و پنجاب و ملبار سے

اُٹھو مالوے اور میوات سے
مہاراشٹر اور گجرات سے

اودھ کے چمن سے چہکتے اُٹھو
گلوں کی طرح سے مہکتے اُٹھو

اُٹھو کھل گیا پرچمِ انقلاب
نکلتا ہے جس طرح سے آفتاب

اُٹھو جیسے دریا میں اُٹھتی ہے موج
اُٹھو جیسے آندھی کی بڑھتی ہے فوج

اُٹھو برق کی طرح ہنستے ہوئے
کڑکتے، گرجتے، برستے ہوئے

غلامی کی زنجیر کو توڑ دو
زمانے کی رفتار کو موڑ دو

* کامگار: مزدور

جمہور

یہ ہندوستاں رشکِ خلدِ بریں — اُگلتی ہے سونا وطن کی زمیں
کہیں کوئلے اور لوہے کی کان — کہیں سُرخ پتھر کی اُونچی چٹان
کہیں سنگ مرمر کی شفاف سل — پھسلتا ہے جس کی صفائی پہ دل
بہت سے خزینے ہیں اس خاک میں — ہزاروں دفینے ہیں اس خاک میں
ہماری گھٹائیں گہربار ہیں — ہمارے بیاباں بھی گلزار ہیں
بڑے رس بھرے ہیں ہمارے ثمر — بہت ہی گھنے ہیں ہمارے شجر
گُلِ لالہ و یاسمن کے ایاغ — مہکتے ہوئے آم کے سبز باغ
لٹکتے ہوئے خوشے انگور کے — چھلکتے ہوئے جام بلّور کے

ہرے اور بھرے جنگلوں کی بہار جھلا جھل چمکتے ہوئے ریگ زار
یہ سورج کی رنگین کرنوں کا جال کہ جس طرح فطرت نے کھولے ہوں بال
افق سے اُبلتا ہوا رنگ و نور فضاؤں میں پرواز کرتے طیور
کہستان کے یہ سنہرے عقاب ہواؤں میں اُڑتے ہوئے آفتاب
کنول جھیل میں مسکراتے ہوئے چراغاں کا منظر دکھاتے ہوئے
یہ پھولوں سے گل پیرہن شاخسار عنبر الوں سے معمور یہ مرغزار
تڑپتی مچلتی ہوئی بجلیاں سمندر میں ملتی ہوئی ندیاں
یہ نیلم اور الماس کے کوہسار یہ چاندی کے پگھلے ہوئے آبشار
یہ مخمل میں لپٹی ہوئی وادیاں ہمالہ کی گل پوش شہزادیاں
یہ گنگا کا آنچل، یہ جمنا کی ریت یہ دھان اور گیہوں کی شاداب کھیت

مگر یہ خزانے ہمارے نہیں
ہمارے نہیں ہیں تمھارے نہیں

یہاں سے جو اُٹھتی ہے لے کر گہر گھٹا وہ برستی ہے انگلینڈ پر
ہمارے مقدر میں افلاس ہے غلامی کی ہر جسم میں باس ہے
ہماری زمیں جتنی زرخیز ہے وبا قحط کی اتنی ہی تیز ہے

جسے دیکھو مفلس ہے کنگال ہے ہر اک شہر ہر گاؤں بنگال ہے
کوئی سسکیاں بھر رہا ہے یہاں کوئی ہچکیاں لے رہا ہے وہاں
کہیں ماؤں بہنوں کا ہے مول تول کہیں بے حیائی کے بجتے ہیں ڈھول
نہ کھانے کو روٹی نہ کرنے کو کام اندھیری ہیں صبحیں المناک شام
نہ ہو عمر کیوں جھونپڑوں میں بسر کہ ہے بھیک پر اب ہماری گذر

ہمیں حکم ہے اس طرح سے جئیں
کہ گنگا کے ساحل پہ پیاسے مریں

ہے ٹوٹا ہوا سازِ بزمِ وطن ہے صدیوں سی افسردہ یہ انجمن
نہ رادھا نہ رادھا کے نوخیز گیت کشن کی نہ وہ بانسری اور نہ پیت
نہ وہ رام کی تمکنت اور وقار نہ لچھمن کی الفت نہ سیتا کا پیار
نہ گوتم کے سینے کا صدق و صفا نہ ساوتری کا خلوصِ وفا
نہ برنائیاں اور نہ رعنائیاں نہ وہ ہیر رانجھا کی انگڑائیاں
نہ نانک کی گفتار کی نرمیاں نہ ٹیپو کی پیکار کی گرمیاں
بھگت سنگھ کے خون کا وہ اُبال نہ چٹگاؤں کے باغیوں کا جلال
محمد علی کے نہ وہ ہماہمے نہ اقبال و ٹیگور کے زمزمے

نہ عصمت، نہ عفت، نہ عزّت نہ شان
نہ غیرت نہ ہمت نہ وہ آن بان
جو جوہر تھے اخلاق و کردار میں
وہ بکتے ہیں اب چور بازار میں
کدورت ہے سینوں میں اور افتراق
نگاہوں میں نفرت دلوں میں نفاق
چلاتا ہے خود بھائی بھائی پہ تیر
غلامی نے بدلا ہمارا ضمیر

بس آپس میں دست و گریباں ہیں ہم
خود اپنے ہی ہاتھوں پریشاں ہیں ہم

مگر پھوٹ کی شاخ پھلتی نہیں
دعاؤں سے قسمت بدلتی نہیں
سیاست کے ہارے جواری ہیں ہم
حکومت کے در کے بھکاری ہیں ہم
بچھاتے ہیں جو بادشاہی کا دام
بناتے ہیں جو آدمی کو غلام
جو چنگیز سے بڑھ کے سفّاک ہیں
جو دجّال کی طرح ناپاک ہیں
جو بدکیش و بدذات و بدکار ہیں
ہم ان سے کرم کے طلب گار ہیں
وہ قاتل فلسطین و یونان کے
وہ دشمن ہیں جاوا کے ایران کے
وہ سینے پہ ہیں ایشیا کے سوار
وہ انسان کا کھیلتے ہیں شکار
اُنھیں ہے شہنشاہیت کا جنون
وہ بچّوں کا بھی چوس لیتے ہیں خون
اُٹھا ہے گناہوں سے اُن کا خمیر
بنا ہے سیاہی سے اُن کا ضمیر

فسوں ان کا بربطِ جنوں ان کا راگ   دہکتی ہے ان کے کلیجے میں آگ
نہ بوئے وفا ان میں ہے اور نہ مہر   رگوں میں ہے ان کی حکومت کا زہر
وہ مظلوم پر رحم کھاتے نہیں   کبھی بھیڑیئے مُسکراتے نہیں
ٹپکتا ہے جبڑوں سے جن کے لہو   بدلتی نہیں ہے کبھی ان کی خو
نہ جانے ہمیں آئے گا کب یقیں   کہ شعلوں سے شبنم ٹپکتی نہیں

اُتارا نہیں توڑا جاتا ہے تاج
کہ مرتا نہیں خود بخود سامراج

ہماری نگاہیں لگی ہیں جہاں   نئی سازشیں ہو رہی ہیں وہاں
وہ بس وار کرنے کو تیار ہیں   کہ غافل ہیں ہم اور وہ ہشیار ہیں
غلامی نئے بھیس میں آئے گی   وہ اک اور سانچے میں ڈھل جائیگی
نیا جال لائے گا صیّاد ابھی   کرے گا ہمیں اور برباد ابھی
حکومت کی اک اور تجویز ہے   مداری کی جھولی میں ہر چیز ہے
وطن ٹکڑے ٹکڑے کیا جائے گا   یہاں یونین جیک لہرائے گا
دکھائی نہ دے گا ہلالی نشاں   ترنگے کی اُڑ جائیں گی دھجّیاں

نحوست یہاں رقص فرمائے گی
غلامی کی زنجیر کس جائے گی

مگر غم نہ کر اے زمینِ وطن — اندھیرے کے سینے سے پھوٹی کرن
اب اُٹھتے ہیں ہندوستاں کے سپوت — لرزتا ہے جن سے حکومت کا بھوت
کسان اور مزدور گاتے ہوئے — اُٹھے اپنا پرچم اُڑاتے ہوئے
یہ ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی — یہ دریا بھی ہیں اور طغیان بھی
ہر اک ان میں کمزور و نادار ہے — مگر اتحاد ان کی تلوار ہے
بڑی سخت راہوں سے گزرے ہیں یہ — بڑے جوش کے ساتھ اُبھرے ہیں یہ
وطن کے شہیدوں کی روحیں ہیں ساتھ — سروں پر ہے جھانسی کی رانی کا ہاتھ
انھوں نے کیا کوہساروں کو پست — حکومت نے مانی ہے ان سے شکست
یہ لڑتے ہیں آندھی سے طوفان سے — یہ ہٹتے نہیں اپنے میدان سے
یہ سولی سے پھانسی سے ڈرتے نہیں — یہ سو بار مر کر بھی مرتے نہیں
یہ جی چھوڑنا جانتے ہی نہیں — یہ منھ موڑنا جانتے ہی نہیں
یہ خود اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں کام — بدلتے ہیں آکر پُرانا نظام
یہ ذوقِ عمل کے پرستار ہیں — یہی عصرِ حاضر کے معمار ہیں

انھیں اپنی دولت پہ ہے اعتماد
انھیں اپنی قوت پہ ہے اعتماد

محبت سے دل ان کا معمور ہے
نیا ان کی محفل کا دستور ہے

نیا ان کا ساقی نئے ان کے جام
نئی ان کی مجلس نیا اہتمام

یہ انساں کی وحدت کے پیغام بر
نئے دَور کی دے رہے ہیں خبر

جمہور کا اعلان نامہ

زمانے کے انداز بدلے گئے
نئے راگ ہیں ساز بدلے گئے

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے

اُٹھا خاک جاوا سے طوفانِ نور
بغاوت نے پھونکا قیامت کا صور

بھڑکتی ہیں ایراں میں چنگاریاں
یہ ہیں صبحِ عشرت کی تیاریاں

اُجالا ہے مشرق کے ایوان میں
سحر ہو گئی شام و لبنان میں

بڑھی لے کے جمہوریت اپنی فوج
ملی نیل سے جا کے دجلے کی موج

جل اُٹھے غلاموں کے سینے کے داغ
بکنگھم میں گُل ہو رہے ہیں چراغ

گرے قصرِ شاہی، ہلے تخت و تاج
نئی کروٹیں لے رہا ہے سماج

ملے زندگی کو نئے بال و پر
نئی منزلیں ہیں نیا ہے سفر

نئے میکدے مسکرانے لگے
نئے جام گروش میں آنے لگے

نئی صبح ہے اور نیا آفتاب
مبارک زمانے کو یہ انقلاب

ہمیں صبحِ نو ہیں ہمیں آفتاب
ہمیں ہیں بغاوت ہمیں انقلاب

اندھیری شبوں کے ستارے ہیں ہم
جو بجھتے نہیں وہ شرارے ہیں ہم

پہاڑوں کو ہٹتے ہیں ہم ریل کر
نکلتے ہیں طوفان سے کھیل کر

امیروں نے ہم کو ستایا بہت
حکومت نے ہم کو دبایا بہت

ہمارے لئے قید خانے بنے
ہمارے لئے تازیانے بنے

ہمیں پتھروں پر سُلایا گیا
ہمیں سولیوں پر چڑھایا گیا

مگر ہم یہ سب ظلم سہتے رہے
مصائب کے دریا میں بہتے رہے

طمانچے حوادث کے کھاتے رہے
مگر اپنا پرچم اُڑاتے رہے

غریبی کے ہاتھوں پریشاں رہے ہواؤں کی زد پر فروزاں رہے
تڑپتے، مچلتے، اُچھلتے رہے چٹانوں کے دل سے اُبلتے رہے
شعاعوں کی صورت بکھرتے رہے بکھرتے، نکھرتے، سنورتے رہے
اُبھرتے رہے مٹ کے ہم بار بار بڑھاتے رہے زندگی کا وقار

کبھی بزدلی ہم پہ چھائی نہیں
ہمیں موت کی نیند آئی نہیں

مگر جو بناتے تھے ہم کو غلام جو جیتے تھے پی کر لہو صبح و شام
بڑا ناز تھا جن کو تلوار پر جو سوتے تھے لاشوں کے انبار پر
جو کرتے تھے دنیا کو زیر و زبر وہ جن کی کنیزیں تھیں فتح و ظفر
اُنھیں کھا گئے آسمان و زمیں نشاں ان کی قبروں کے ملتے نہیں
کہاں ہیں وہ فرعون و ہامان اب کہاں ہیں وہ خونخوار سلطان اب
وہ شاہانِ نسلِ کیانی کہاں وہ جبر و تشدد کے بانی کہاں
وہ نادر کہاں ہے سکندر کہاں کہاں ہے مسولینی، ہٹلر کہاں
وہ چین اور تاتار کے کج کلاہ جو بیٹھے تھے بن بن کے عالم پناہ
درندے جو دشمن تھے انسان کے جو پھوڑے تھے طاعون و سرطان کے

وہ سب موت کی گود میں سو گئے
وہ سب وقت کی گرد میں کھو گئے
نہ چنگیز ہے اور نہ تیمور ہے
جو باقی ہے کوئی تو جمہور ہے
زمانے کے دریا کی موجِ رواں
ازل سے ابد تک رواں اور دواں
ہزاروں برس کی کہانی ہیں ہم
کہ فانی نہیں جاودانی ہیں ہم
ہمیں سے ہیں تہذیب کے نقش و رنگ
ہمیں سے تمدّن کے دل کی اُمنگ
ہمارے ہی دم سے نشانِ حیات
ہمیں دیں گے انسانیت کو نجات
مسیحا کے ہونٹوں کا اعجاز ہم
محمدؐ کے سینے کی آواز ہم
ہماری جبیں پر ہے محنت کا تاج
ہمیں نے لیا ہے زمیں سے خراج
ہماری ہی قوّت سے چلتے ہیں ہل
دھڑکتے ہیں ہم سے مشینوں کے دل
ہواؤں میں پرواز کرتے ہیں ہم
طرارے سمندر میں بھرتے ہیں ہم
کیا ہم نے فطرت کو زیرِ نگیں
جھکا دی زمیں پر فلک کی جبیں
کیا زندگی سے اندھیرے کو دور
نچوڑا ہے سورج کی کرنوں سے نور
ہمیشہ سے ہم گرم پیکار ہیں
تواریخ کی تیز تلوار ہیں

فرانسیس کے سر پہ کڑکے تھے ہم — شکاگو کے پہلو میں پھڑکے تھے ہم

دیا ہے نئے عہد کو ہم نے خون — بنایا تھا پیرس میں ہم نے کمیون

جو لینن کے سینے میں طوفان تھا — ہمارے سمندر کا ہیجان تھا

وہ انساں کی جنت وہ سرخ انجمن — ہماری جبیں کی ہے پہلی کرن

جو یورپ کی راتوں میں ہیں ضو فشاں — ہماری نگاہوں کی ہیں بجلیاں

دلِ ایشیا میں جو ہے اضطراب — ہماری ہی ہے روح کا پیچ و تاب

یہ صدیوں کے انسان کا سوز ہے
یہ جمہور کا جشنِ نو روز ہے

ہماری نگاہوں میں پیغامِ عید — ہمیں سے ہے ہندوستاں کی امید

ہمیں ڈھال ہیں، ہم ہی تلوار ہیں — ہمیں فوج ہیں ہم ہی ہتھیار ہیں

زمیندار ہوں یا کہ سرمایہ دار — ولایت کے حاکم ہوں یا شہریار

وجود ان کا ہندوستاں پر ہے بار — کہ جس طرح سورج کے رخ پر غبار

یہ ہیں فخر حیوانیت کے لئے — یہ ہیں کوڑھ انسانیت کے لئے

بلندی سے نیچے گرا دو انھیں — یہ پیغام جا کر سنا دو انھیں

حیات آپ سے آج بے زار ہے

حضور آپ کی قبر تیار ہے

چمن اس کا ہے جو چمن میں رہے
وطن اس کا ہے جو وطن میں رہے

ہر اک قوم آزاد و آباد ہو
ہر اک اپنے گھر رہ کے دل شاد ہو

ہر اک اپنے خطے میں پھولے پھلے
ستاروں سے ہم دوش ہو کر چلے

مٹے اس طرح عمر بھر کا فساد
وطن میں ہو قائم نیا اتحاد

دھنک میں کئی طرح کے رنگ ہوں
مگر پھر بھی وہ سب ہم آہنگ ہوں

یہ دولت ہے میراث انسان کی
زمیں پر حکومت ہے دہقان کی

ملوں پر ہے مزدور کا اختیار
وطن پر ہے جمہور کا اختیار

جو موتی نکالے وہ دامن بھرے
جو محنت کرے وہ حکومت کرے

ہماری کسوٹی ہے انسانیت
اخوّت، مساوات اور حرّیت

محبت کے جذبے ابھاریں گے ہم
پریشان زلفیں سنواریں گے ہم

عناصر کے گھوڑوں پہ ہو کر سوار
کریں گے غریبی کے سینے پہ وار

سمندر سے موتی نکل آئیں گے
زمیں کے خزانے ابل آئیں گے

گھٹاؤں میں تبدیل ہوگا دھواں   برسنے لگیں گے ستارے یہاں
نہ پھر خوف ہوگا نہ پھر احتیاج   نئے سر سے تعمیر ہوگا سماج
یہ افلاس کی رات ڈھل جائے گی   کسانوں کی دُنیا بدل جائے گی
رہے گا نہ کوئی بھی بے روزگار   مصیبت سے چھُٹ جائیں گے کامگار
نہ ہوگا مشینوں کا انساں غلام   مشینوں پہ قبضہ کریں گے عوام
سجا دیں گے چیزوں سے بازار ہم   لگا دیں گے دولت کے انبار ہم
پہنائیں گے بچوں کو رختِ حریر   ہمالہ سے لائیں گے ہم جوئے شیر
سنہرے دوپٹے اُڑھائیں گے ہم   ستاروں سے آنچل بنائیں گے ہم
پھلے اور پھولے گا بھارت کا باغ   جلیں گے ہر اک گھر میں گھی کے چراغ
کریں گے یہاں رقص حسن و شباب   زمیں پر اُتر آئے گا آفتاب
وہ شاداب چہروں پہ ہوگا نکھار   کہ جھینپیں اجنتا کے نقش و نگار

نئی دیں گے ماتھوں کو تنویر ہم
بدل دیں گے انساں کی تقدیر ہم

۱۱ر دسمبر ۱۹۴۵ء
